حکومت بہار
اردو ڈائرکٹوریٹ
بہار، پٹنہ

فردنامہ-۹

رمز عظیم آبادی

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم

Monograph-9

Ramz Azeemabaadi

By Dr. Nasim Ahmad Nasim

دبستان بہار کے جن شعراء نے اپنی خداداد شاعرانہ صلاحیت اور اپنی اعلیٰ وارفع شاعری کے سبب قومی سطح پر عزت اور مقبولیت حاصل کی، اُن میں رمز عظیم آبادی کا نام بھی نمایاں اور محترم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ رمز عظیم آبادی نے بہت غربت اور عُسرت میں زندگی گزاری۔ وہ باقاعدہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ مگر حیرت، تعریف اور رشک کی بات یہ ہے کہ انھوں نے جس بلند معیار کی شاعری کی، وہ بڑے سے بڑے تعلیم یافتہ حضرات کے لئے ممکن نہیں ہے۔

رمز میں شعر وشاعری کی خداداد صلاحیت تھی۔ ان کی شاعری دانشوارانہ احساسات وجذبات کی سلگتی ہوئی سخنوری ہے۔ اس کے اندر زندگی کا سچ بولتا ہے۔ ان کا یہ شعر مشہور زمانہ ہے۔

بیٹی کو گھر ملا تو مرا گھر چلا گیا + شادی میں رمز قرض لیا تھا مکان پر

اس شعر میں معاشرے کا کرب بھی ہے اور تلخ سچائی بھی۔

رمز عظیم آبادی غزلیں بھی کہتے تھے اور نظمیں بھی۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ ان کی نظموں میں بڑی دلکشی، روانی اور امتیازی شان ہے۔ ان کی شاعری کا لب ولہجہ نیا ہے، مگر انھوں نے روایت کا احترام بھی کیا ہے۔ ان کی نظم نگاری کا بڑا شہرہ تھا۔ ایک بار وہ مشاعرے میں کشمیر گئے۔ وہاں پنڈت جواہر لال نہرو مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے۔ اس مشاعرے میں انھوں نے کشمیر پر لکھی ہوئی نظم 'بہاروں کی دنیا' کو اس شان اور حسن کے ساتھ سنایا کہ پوری محفل جھوم اُٹھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بڑی تعریف کی اور وہ کشمیر میں تین دنوں تک سرکاری مہمان بن کر رہے۔

رمز نے اپنی زندگی میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ ان کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آج بھی ان کے کئی شاگردان اردو شاعری کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔

رمز کی شاعری عصرِ حاضر میں بھی بڑی معنویت اور اہمیت کی حامل ہے۔ ان کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے کہ :

جدّتِ فن نے مجھے ضَو دی ہے، میں تابندہ ہوں   آج دنیا کچھ کہے، میں شاعر آئندہ ہوں
مرا شعور زماں و مکاں سے آگے ہے   تم اس صدی کے تناظر میں مجھ کو مت دیکھو

اس فردنامے کے مصنف ڈاکٹر نسیم اختر نسیم اردو کے سنجیدہ ناقد، محقق اور ادیب ہیں۔ انھیں اردو فکشن اور شاعری کی صنف سے خاص شغف ہے۔ فکشن اور شاعری سے متعلق اب تک ان کی نصف درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ رمز عظیم آبادی کی حیات اور شاعری پر مبنی ان کا یہ فردنامہ رمز شناسی کے باب میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ توقع ہے کہ ان کی اِس تحقیقی اور تنقیدی تصنیف کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔

امتیاز احمد کریمی

प्रकाशक
उर्दू निदेशालय
मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

رمز عظیم آبادی

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم

طابع وناشر:

اردو ڈائرکٹوریٹ

محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔ ۹

Ramz Azeemabaadi

By

Dr. Naseem Ahmad Naseem

نام کتاب	:	رمز عظیم آبادی
مصنف	:	ڈاکٹر نسیم احمد نسیم
سال اشاعت	:	2019ء
کل صفحات	:	128
کمپوزنگ	:	نصیب اللہ عمری، بتیا
ترتیب وتزئین	:	محمد رضاء اللہ قاسمی
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	تاج آفسیٹ پریس، دریاپور، پٹنہ۔۴

رابطہ : 9334020186

ملنے کا پتہ:

اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱

فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

مشمولات

پیش لفظ:	امتیاز احمد کریمی	۴
رمزؔ عظیم آبادی : ایک معروضی تعارف	اسلم جاوداں	۶
ابتدائیہ :	ڈاکٹر نسیم احمد نسیم	۹

عنوانات

رمزؔ عظیم آبادی: سوانحی کوائف	۱۳
رمزؔ عظیم آبادی: حالات زندگی	۱۵
رمزؔ عظیم آبادی کی شاعری کا آغاز	۳۳
رمزؔ عظیم آبادی کی نظمیں	۵۶
رمزؔ عظیم آبادی کی غزلیں	۷۷
رمزؔ عظیم آبادی کی قطعات ورباعیات نگاری	۹۷
تلامذۂ رمزؔ عظیم آبادی	۱۳۰

پیش لفظ

بہار کی سرزمین ہمیشہ سے بڑی مردم خیز رہی ہے۔ یہاں ہر شعبہ حیات میں نابغۂ روزگار اور یکتائے زمانہ شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ شعر وادب کا شعبہ بھی اس وصف سے خالی نہیں ہے۔ یہاں ایسے ایسے ادبی لعل و گہر پیدا ہوئے، جنھوں نے صرف ریاست ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے ادب میں بہار کا نام سر بلند کیا اور تاریخ ادب اردو میں اپنی ادبی وشعری عظمت کا لوہا منوالیا۔

شادؔ عظیم آبادی، امداد امام اثرؔ، فضلِ حق آزاد، شوقؔ نیموی، انجمؔ مانپوری، یاسؔ یگانہ چنگیزی، بیدلؔ عظیم آبادی، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، عطاؔ کاکوی، اجتبیٰ رضوی، کلیم الدین احمد، اخترؔ اورینوی، پرویز شاہدی، سہیلؔ عظیم آبادی، کلیم احمد عاجزؔ، رضا نقوی واہی، واقفؔ عظیم آبادی، رمزؔ عظیم آبادی، شکیلہ اخترؔ، شین مظفر پوری، غیاث احمد گدّی، مظہر امام، کلام حیدری، شکیل الرحمٰن، الیاس احمد گدی، شفیع جاوید، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، لطف الرحمٰن وغیرہ ایسی، مستند، معتبر اور بلند قامت ادبی شخصیتیں ہیں جن پر اردو شعر وادب بجا طور ناز کر سکتا ہے۔ یہ تمام اکابرین ادب دبستان بہار کے معمار ہیں۔

اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار، دبستان بہار کی ایسی مقتدر اور سرکردہ ادبی شخصیتوں کی خدمات شعر وادب کا صمیم قلب سے معترف اور قدر دان ہے، نیز ان کے ادبی وشعری سرمائے کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے منصوبے پر کاربند ہے۔ دبستان بہار کے ان لعل و گہر کو نئی نسل تک پہنچانا، ان سے متعارف کرانا، ان کی عظمت اور خدمت سے انھیں روشناس کرانا۔ ان کے دلوں میں اکابرین زبان وادب کی قدر ومنزلت پیدا کرنا، ہمارا نصب العین ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام دبستان بہار کے مشاہیر و اکابرین ادب کی شعری وادبی خدمات کی تفہیم اور ان کے شخصی تعارف کے لئے شادؔ عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، کلیم عاجزؔ، سہیلؔ عظیم آبادی، عبدالمغنی، رضا نقوی واہی، وہاب اشرفی، رمزؔ عظیم آبادی، پرویز شاہدی اور شین مظفر پوری پر فرد نامے شائع کئے جا رہے ہیں۔

دبستان بہار کے جن شعراء نے اپنی خداداد شاعرانہ صلاحیت اور اپنی اعلیٰ و ارفع شاعری کے سبب قومی سطح پر عزت اور مقبولیت حاصل کی، اُن میں رمزؔ عظیم آبادی کا نام بھی نمایاں اور محترم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ رمزؔ عظیم آبادی نے بہت غربت اور عُسرت میں زندگی گزاری۔ وہ باقاعدہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ مگر حیرت، تعریف اور رشک کی بات یہ ہے کہ انھوں نے جس بلند معیار کی شاعری کی، وہ بڑے سے بڑے تعلیم یافتہ حضرات کے لئے ممکن نہیں ہے۔

رمز میں شعر و شاعری کی خداداد صلاحیت تھی۔ ان کی شاعری دانشوارانہ احساسات و جذبات کی سلگتی ہوئی سخنوری ہے۔ اس کے اندر زندگی کا سچ بولتا ہے۔ ان کا یہ شعر مشہور زمانہ ہے۔

بیٹی کو گھر ملا تو مِرا گھر چلا گیا + شادی میں رمز قرض لیا تھا مکان پر

اس شعر میں معاشرے کا کرب بھی ہے اور تلخ سچّائی بھی۔

رمزؔ عظیم آبادی غزلیں بھی کہتے تھے اور نظمیں بھی۔ لیکن سچّائی یہ ہے کہ ان کی نظموں میں بڑی دلکشی، روانی اور امتیازی شان ہے۔ ان کی شاعری کا لب و لہجہ نیا ہے، مگر انھوں نے روایت کا احترام بھی کیا ہے۔ ان کی نظم نگاری کا بڑا شُہرہ تھا۔ ایک بار وہ مشاعرے میں کشمیر گئے۔ وہاں پنڈت جواہر لال نہرو مشاعرے کی صدارت فرمارہے تھے۔ اس مشاعرے میں انھوں نے کشمیر پر لکھی ہوئی نظم 'بہاروں کی دنیا' کو اس شان اور حسن کے ساتھ سنایا کہ پوری محفل جھوم اُٹھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بڑی تعریف کی اور وہ کشمیر میں تین دنوں تک سرکاری مہمان بن کر رہے۔

رمز نے اپنی زندگی میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ ان کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آج بھی ان کے کئی شاگردان اردو شاعری کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔

رمز کی شاعری عصرِ حاضر میں بھی بڑی معنویت اور اہمیت کی حامل ہے۔ ان کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے کہ :

حِدّتِ فن نے مجھے ضَو دی ہے، میں تابندہ ہوں   آج دنیا کچھ کہے، میں شاعر آئندہ ہوں
مرا شُعور زماں و مکاں سے آگے ہے   تم اس صدی کے تناظر میں مجھ کو مت دیکھو

اس فردنامے کے مصنف ڈاکٹر نسیم اختر نسیم اردو کے سنجیدہ ناقد، محقق اور ادیب ہیں۔ انھیں اردو فکشن اور شاعری کی صنف سے خاص شغف ہے۔ فکشن اور شاعری سے متعلق اب تک ان کی نصف درجن کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ رمزؔ عظیم آبادی کی حیات اور شاعری پر مبنی ان کا یہ فردنامہ رمز شناسی کے باب میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ توقع ہے کہ ان کی اِس تحقیقی اور تنقیدی تصنیف کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔

امتیاز احمد کریمی
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

رمزؔ عظیم آبادی: ایک معروضی تعارف

مختصر تعارف

رمزؔ عظیم آبادی جون ۱۹۱۶ء میں پٹنہ (عظیم آباد) میں قدرت اللہ خاں کے گھر پیدا ہوئے۔ اِن کا شمار اُن باکمال شاعروں میں ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی بے پناہ شاعرانہ قدرت اور خداداد صلاحیت کے بل بوتے پر صفِ اوّل کے شعرا میں اپنی جگہ مخصوص کرلی اور پورے ملک میں بہار کی شاعرانہ عظمت کا سکّہ جما دیا۔ رمز انتہائی غریب گھرانے میں پیدا ہوئے، رسمی درس و تدریس سے انہیں برائے نام واسطہ رہا۔ بقول معین کوثر رمزؔ نے بتایا تھا کہ اُنھوں نے اردو اسکول، گلزار باغ، پٹنہ سٹی، پٹنہ میں کچھ دنوں تعلیم حاصل کی تھی؛ لیکن ان کا ذاتی مطالعہ اتنا وسیع اور گہرا تھا، زبان و بیان پر انہیں اتنی مہارت اور قدرت حاصل تھی کہ ان کی شاعری دانشورانہ فکر اور فن کا امتزاج بن گئی ہے۔ رمز نے پوری زندگی غربت اور عسرت دیکھی۔ اُن کی زندگی کی راہ میں دھوپ ہی دھوپ تھی، سائے بہت کم آئے۔ ابتدا میں وہ معاش کی تلاش میں کلکتہ گئے۔ حکومت بہار کے سابق وزیر اور مشہور کانگریسی رہنما عبدالقیوم انصاری کی کوششوں سے رمزؔ کو محکمہ پی ڈبلیو ڈی میں ملازمت مل گئی تھی، جہاں سے وہ مارچ ۱۹۹۱ء میں سبکدوش ہوئے۔

رمزؔ نے 1949ء میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ ابتدا میں منظر عظیم آبادی سے پھر ثاقب عظیم آبادی اور پرویز شاہدی سے اصلاح لی۔ جلد ہی ان کی بے مثل اور باکمال شاعری کی گونج ہندستان کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ 1956ء میں 'جشن کشمیر' کے موقع پر وہ حکومت بہار کی جانب سے کشمیر گئے اور مشاعرے میں اپنی نہایت خوبصورت اور دلپذیر نظم 'بہاروں کی دنیا' (کشمیر) سنا کر مشاعرہ لوٹ لیا۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو جو صدر مشاعرہ تھے، انھوں نے رمزؔ کو خوب سراہا اور فرماں روائے کشمیر نے اُنھیں تین دنوں تک شاہی مہمان بنا کر رکھا۔

رمزؔ کے قدردانوں میں سابق گورنر بہار اخلاق الرحمٰن قدوائی، سابق وزیر اعلیٰ بہار لالو پرساد، سابق وزیر عبدالقیوم انصاری، سابق وزیر شمائل نبی، سابق صدر نشیں اقلیتی کمیشن، ہارون رشید، سابق

ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری، عابد رضا بیدارؔ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ رمزؔ غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے؛ مگر نظم نگاری میں اُنھیں جو مہارت اور امتیازی شان حاصل تھی، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

رمزؔ کے کلام میں زندگی کی سچّائی اور مٹّی کی خوشبو ہے۔ اُن کا لب ولہجہ نیا، فکر منفرد مگر شاعری روایت کے احترام کے ساتھ دلکشی اور دِل پذیری سے بھرپور ہے۔ رمزؔ کو زندگی میں ہی بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ سیاہ فام، حبشی وضع رمزؔ کی شاعری کے سامنے بڑے بڑے گُل رخوں کی شمعِ سخن کم ضو ہوگئی۔ اردو، کشمیر، تاج محل وغیرہ پر ان کی شاندار اور یادگار نظمیں ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد تین درجن سے بھی زیادہ ہے۔ جن میں بدیع الزماں سحرؔ، کیف عظیم آبادی، معین کوثرؔ، ضیاء الرحمٰن ضیاؔ، شاداب رضی، فراہیم احمد شارب، پریم کرن، افتخار عاکفؔ، رشید عارفؔ، احسن راشدؔ، کاظم رضا وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا شعری سرمایہ بے حد وقیع اور عظیم المرتبت ہے۔ بہار کی تاریخ سخن میں رمزؔ کا نام نہایت روشن اور قابلِ احترام ہے۔

مجموعہ شاعری

(۱) نغمۂ سنگ: پہلا مجموعہ شاعری ۱۹۸۸ء میں بہار اردو اکادمی سے شائع ہوا۔

(۲) شاخِ زیتون: دوسرا مجموعہ شاعری ۱۹۹۸ء معین کوثر اور فیاض الرحمٰن نے شائع کرایا۔

اعزاز وانعام

☆ ۱۹۸۴ـ۸۵ء میں بہار اردو اکادمی نے انہیں اعزاز سے نوازا۔

☆ ۱۹۸۵ـ۸۶ء میں محکمہ راج بھاشا، حکومت بہار نے اُنہیں ''اعلیٰ سطحی ایوارڈ'' سے سرفراز کیا۔

☆ سابق گورنر بہار ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے تاحیات وظیفہ مقرر کیا۔

☆ خدا بخش لائبریری نے رمزؔ کے اعزاز میں ''آج کی شام: رمزؔ عظیم آبادی کے نام'' آراستہ کیا۔

اِنتخاب اشعار

- حدّتِ فن نے مجھے ضو دی ہے میں تابندہ ہوں / آج دنیا کچھ کہے میں شاعرِ آئندہ ہوں
- اندھیرا بہت رمزؔ ذہنوں میں تھا / میں سورج کی مانند جلتا رہا
- پتھر پہ ابھرتا ہے وہی نقش کی صورت / جو گیت زمانہ کبھی گانے نہیں دیتا
- بیٹی کو گھر ملا تو مرا گھر چلا گیا / شادی میں رمزؔ قرض لیا تھا مکان پر
- دنیا اُسے حقیر سمجھتی ہے آج بھی / کردار اُس کا گرچہ مثالی رہا تو کیا

- رمزؔ شکستہ آئینے کا ہر ٹکڑا اک چہرہ ہے / شیش محل کو توڑ کے دیکھو سیکڑوں گھر بن جائیں گے
- دوسروں کو جرأتِ اظہار کا پہلو ملے / اپنا قصّہ شہر کی دیوار پر لکھا کرو
- بیچ کے ہم تقدیسِ غزل کو سوداگر بن جائیں گے / شیشے کا بیوپار کریں گے خود پتھر بن جائیں گے
- ہر آدمی کو یہاں دعویِ خدائی ہے / اکیلی جان ہے کس کس کا احترام کرے
- قلم فنکار کا بِکتا نہیں ہے ٹوٹ جاتا ہے / کسی بھی جھوٹ کو رنگِ صداقت ہم نہیں دیں گے
- رمزؔ میری ہر غزل ہے زندگی کا آئینہ / شعر کے سانچے میں اک اک سانحہ ڈھلتا رہا
- یہ کس مقام پہ چھوڑا ہے وقت نے لاکر / نہ زندگی کی تمنّا نہ زندگی سے فرار
- میں ترے دولت کدے کا کس لیے احسان لوں / لاکھ ویرانہ سہی، لیکن وہ میرا گھر تو ہے
- جس نے سمجھ لیا ہے مزاجِ فراز راہ / اس نے قدم سنبھال کہ رکھا ڈھلان پر
- اسے خیال ہے تشکیلِ جادۂ نوکا / کسی کے ساتھ وہ آمادۂ سفر نہ ہوا
- اپنا ہمسایہ ہے لیکن فاصلہ برسوں کا ہے / ایسی قربت اتنی دوری جس میں حیرانی بھی ہے
- ملو جس سے بھی وہ سود و زیاں کی گفتگو چھیڑے / ہمارے عہد میں رشتہ بھی کاروبار جیسا ہے
- آنے والی نسلیں ہم کو بھول سکیں ناممکن ہے / نقشِ قدم کے مٹتے مٹتے راہ گزر بن جائیں گے
- جن کی عظمت لے رہی ہے چاند تاروں سے خراج / بوریئے کے بیٹھنے والے بشر ایسے بھی ہیں
- غریب کو بھی کتابوں کا شوق ہوتا ہے / غلط نگاہ سے مت اس کی حیثیت دیکھو
- تم پسینہ مت کہو ہے جانفشانی کا لباس / دھوپ میں چلتے ہوئے رکھتے ہیں پانی کا لباس
- خدمتِ فن کا یہ جذبہ کبھی کم مت رکھنا / جب تلک ہاتھ میں جنبش ہے قلم مت رکھنا
- تمھیں ہے سر کی ضرورت، ہمیں شہادت کی / تم اپنا کام سنبھالو ہم اپنا کام کریں
- ہمیں رلاتے ہو لیکن وہ دن بھی آئے گا / ہنسو تو ہنستے رہو وہ عذاب ہم دیں گے
- اب تو ہر شہر میں ہے کوہ ندا کا ماحول / راستہ چلتے ہوئے ہوش میں کب ہے کوئی
- جب تک تھکن نہیں تھی رہا میں حریفِ موج / احساسِ خستگی ہی تہہِ موج لے گیا
- مرا شُعور زمان و مکاں سے آگے ہے / تم اس صدی کے تناظر میں مجھ کو مت دیکھو
- اس کی انا کو سکّۂ تحسین چاہیے / خیرات دینے والا بھی کاسہ بدست ہے
- تمام رات اندھیرے سے لڑ تو سکتا تھا / یہ مت کہو کہ اکیلا چراغ کیا کرتا

(ماخذ — نغمۂ سنگ، شاخِ زیتون)

— اسلم جاوداں

ابتدائیہ

فضل حق آزادؔ عظیم آبادی کا ایک معروف شعر ہے ۔

یہ بستی اب بھی بازارِ ختن ہے باکمالوں سے
غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے

یہ شعر کس پس منظر میں کہا گیا اور اس وقت شاعر کے ذہن میں دبسانِ عظیم آباد کے کون کون سے باکمال فنکار تھے، یہ ایک تحقیق طلب امر ہے؛ لیکن اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ عظیم آباد اسکول نے ہر عہد میں ایسے ایسے گوہر آبدار پیدا کیے، جن کی شہرت وعظمت کا ہر زمانے نے اعتراف کیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

رمزؔ عظیم آبادی بھی انھیں باکمالوں کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں۔ رمزؔ بطور شاعر عظیم آباد کیا، پوری اردو دنیا میں معروف ہیں۔ ان کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے گھر میں پیدا ہوئے، جہاں عسرت وناداری پہلے سے اپنا پر پسارے سورہی تھی۔ اس گھر میں دو وقت کی روٹی جٹانا مشکل تھا۔ ایسے میں رمزؔ کے والدین کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ رمزؔ کو اسکول اور کالج کی تعلیم سے آراستہ کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کوئی باضابطہ تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ گئے اور جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو ان پر ایک اور بڑی افتاد آپڑی؛ یعنی جو عمر پڑھنے لکھنے اور کھیلنے کودنے کی تھی، اس عمر میں انھیں تلاشِ رزق کے لیے دردر بھٹکنے پر مجبور ہونا پڑا اور اس کی انتہا اس وقت ہوگئی، جب انھیں رکشہ کھینچنا پڑا، ہوٹلوں میں مزدوری کرکے پیٹ پالنا پڑا۔ اردو ادب کی تاریخ میں مزدور اور محنت کش فنکاروں کا سراغ تو ملتا ہے؛ لیکن رمزؔ جیسا فنکار نہیں ملتا، جس نے زندگی کی صعوبتوں اور مصیبتوں سے مقابلہ کرتے ہوئے خود کو بلند حوصلہ رکھا اور اپنی ذاتی کوشش اور ادب سے حد درجہ محبت کے سبب اخیر عمر تک گیسوئے اردو کو سنوارتا رہا اور نئی نئی فتوحات کو اپنے نام درج کرتا رہا۔

لیکن جہاں ایک طرف قدرت نے رمزؔ کو مصائب اور مشکلات میں رکھا تو دوسری طرف

انھیں ایک عظیم تحفے سے بھی نوازا؛ یعنی قدرت نے چپکے سے ان کے اندر ایک بڑا فنکار بھی رکھ دیا اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ہی اس کم علم، کم مایہ اور کم حیثیت انسان نے اپنے ذوق وشوق اور ذاتی دلچسپی اور انہماک سے نہ صرف ادب کو غائر نظر سے پڑھا؛ بلکہ دیکھتے دیکھتے وہ اردو ادب کا ایک مضبوط اور دیرپا ستون بھی بن گیا۔

رمزؔ کو اپنے عہد میں وہ اہمیت وعزت نہیں ملی، جس کے وہ مستحق تھے؛ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کی شاعرانہ عظمت ورفعت کا اعتراف کیا گیا اور ان کے ادبی مقام ومرتبے کے تعین کا آغاز بھی ہوا۔ وہ ایک فطری شاعر تھے۔ طبیعت حد درجہ موزوں تھی؛ اس لیے خوش گو کے ساتھ زود گو بھی تھے۔ انھوں نے بڑی تعداد میں رمضانی قصیدے لکھے۔ قوالوں کے لیے کلام تیار کیے اور خانقاہوں ودیگر دینی مجالس کے لیے حمد، نعت اور مناقب کی تخلیق بھی کی؛ مگر آگے چل کر ان کی حقیقی پہچان ایک نظم گو شاعر کے طور پر ابھری اور وہ رفتہ رفتہ پوری اردو دنیا میں اپنی نظموں کے ذریعے شہرت کی بلندیوں پر جاپہنچے۔ وہ غزلیں بھی خوب کہا کرتے تھے۔ ان کی غزلوں کے متعدد اشعار بہت مقبول ہوئے اور آج بھی ان کی شاعری پر اظہار خیال کرنے والے اہلِ قلم ان کے غزلیہ اشعار کو خصوصیت کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ رمزؔ نے قطعات ورباعیات کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی اور بہت ہی عمدہ، بامعنی اور برجستہ قطعات ورباعیات کے ذریعہ اپنا بھرپور نقش چھوڑا۔

رمزؔ کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ انھوں نے نظمیں ہوں، یا غزلیں، یا قطعات ورباعیات، ہر جگہ اپنی مخصوص اور منفرد شناخت برقرار رکھی۔ انھوں نے اپنی ذات، ملکی وبین الملکی حالات اور اپنے اطراف وجوانب کو خالص اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں دیکھا، پرکھا اور انھیں شعری قالب عطا کیا۔

اس کتاب (مونوگراف) کے ذریعے رمزؔ کی حیات اور ان کی خدمات پر حتی المقدور روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے آغاز میں ان کا مختصر سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے؛ تاکہ ایک نظر میں ان کی شخصیت اور کارنامے کی جھلک مل جائے۔ اس کے بعد تفصیل سے ان کے حالاتِ زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بچپن سے لے کر اخیر عمر تک کے تقریباً تمام اہم واقعات اور ان سے جڑی شخصیات کو دائرہ تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی ہے؛ تاکہ ان کی زندگی کے پیچ وخم بھی ظاہر ہوجائیں اور ان کی شاعری کے آغاز وارتقا کے متعلق بھی جانکاری مہیا ہوجائے۔ آگے کے باب میں ان کی قصیدہ نگاری اور قوالی کے کلام کے متعلق کچھ ضروری امور کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔

رمزؔ بنیادی طور پر نظموں کے شاعر ہیں؛ اس لیے ان کی نظمیہ شاعری پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ انداز معروضی اور مطالعہ تجزیاتی ہو۔ نظم کے بعد ان کی غزل گوئی کا مقدور بھر تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، نیز ان کے مختلف اشعار کو نقل کرتے ہوئے ان کی غزلیہ شاعری کی تفہیم کی راہ ہموار کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ رمزؔ کے یہاں نظم اور غزل کے علاوہ قطعات و رباعیات بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اس حصے میں قطعہ اور رباعی کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے اس میدان میں ان کی فنکارانہ کاوشوں کو اجاگر کرنے کا جتن کیا گیا ہے۔

اس مختصر کتاب کے اخیر میں رمزؔ عظیم آبادی کے دونوں مجموعۂ کلام ''نغمۂ سنگ'' اور ''شاخِ زیتون'' سے چند اہم نظموں اور غزلوں کو بطور نمونۂ کلام نقل کیا گیا ہے؛ تاکہ ان کے مطالعے سے شاعر کے مزاج و منہاج اور اس کے تخلیقی مراحل اور مدارج کے متعلق واقفیت ہو سکے۔ کتاب کے اخیر میں رمزؔ کے اُن شاگردوں کی ایک فہرست دی گئی ہے، جنھوں نے صرف رمزؔ سے استفادہ ہی نہیں کیا؛ بلکہ ان کی آخری سانس تک ان کے ساتھ رہے۔

اس کتاب کی تیاری میں راقم الحروف نے ''وہ سنگ میل جو لپٹا ہوا غبار میں تھا''۔ ''رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، منصوبہ و تحقیق: محمد شمس الحق (ناشر سلسلہ، پٹنہ بہار) سے بھرپور استفادہ کیا ہے؛ بلکہ یہ کہا جائے کہ رمزؔ کی حیات اور فن پر بنیادی نوعیت کی یہ کتاب موجود نہ ہوتی تو اس مونوگراف کی تکمیل شاید ابھی تک التوا میں رہتی۔ اس کتاب میں شامل متعدد معتبر مضمون نگاروں اور ناقدین کی تحریروں کو حوالے کے ساتھ نقل کیا گیا ہے؛ تاکہ رمزؔ فہمی کا مرحلہ آسان سے آسان تر ہو سکے۔

اس کے علاوہ ''شاخِ زیتون'' میں شامل سینئر فنکاروں اور نقادوں کی آرا اور تنقید سے بھی استفادے کی راہ ہموار کی گئی ہے۔ اس کتاب کی تکمیل میں رمزؔ کے شاگردان میں جناب معین کوثر اور کاظم رضا نے براہِ راست میرا تعاون کیا۔ اس کتاب میں ''شاخِ زیتون'' کے مرتبین سید فیاض الرحمٰن شارقؔ اور معین کوثر صاحب کی تیار کردہ رمزؔ کی مختصر سوانح اور ان کے شاگردان کی فہرست سے بھی براہ راست استفادہ کیا گیا ہے۔ مختصر سوانحی خاکوں سے استفادے کے مرحلے میں زبیر بھاگلپوری صاحب کی تحریر سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ان حضرات کے علاوہ تقریباً ایک درجن سے زیادہ ایسے قلم کار ہیں، جنھوں نے رمزؔ کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے انفراد کی بابت اظہار خیال کیا ہے اور ان کے اعتراف میں منثور اور منظوم تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ اس کتاب میں ان سے کچھ مضامین

اور تاثرات کو حوالے کے ساتھ پیش کر کے رمزؔ کی شخصیت اور ان کے فن کی حتی الامکان تفہیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اب اس تحریر کے اخیر میں یہ اعتراف کرتا چلوں کہ میں ایک کم سواد آدمی ہوں؛ اس لیے یہ اہم اور کٹھن کام میرے بس کا نہیں تھا؛ لیکن اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے ذمہ داران بالخصوص محکمے کے ڈائرکٹر جناب امتیاز احمد کریمی اور پروگرام آفیسر ڈاکٹر اسلم جاوداں صاحب نے مجھے اس لائق سمجھا، میں اس کے لیے ان کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔

رمزؔ عظیم آبادی کی شخصیت اور شاعری پر میرا یہ کام حرف آخر جیسی کوئی چیز ہرگز نہیں ہے۔ میں نے صرف ڈول ڈالنے کا کام کیا ہے۔ امید ہے آنے والے وقتوں میں ان پر تفصیل کے ساتھ بڑا اور معیاری کام انجام پائے گا۔

اس کتاب میں ہو سکتا ہے بہت سی کمیاں اور خامیاں رہ گئی ہوں تو اس کے لیے میں خود کو ذمہ دار تصور کرتا ہوں اور اگر اتفاق سے کوئی خوبی پیدا ہو گئی ہو تو اسے قارئین کے حسنِ نظر پر محمول کرتا ہوں۔ امید قوی ہے کہ قارئین اور اہالیان ادب اپنی بیش قیمت آرا سے ضرور نوازیں گے؛ تاکہ ان کی روشنی میں ہماری اصلاح بھی ہو سکے اور آئندہ خوب سے خوب تر کی تلاش بھی جاری رہ سکے۔ شکریہ!

نسیم احمد نسیم

۳۰؍جولائی ۲۰۱۹ء

رمزؔ عظیم آبادی: ایک نظر میں

نام	: رضا علی خاں
تخلص	: رمزؔ عظیم آبادی
والد	: قدرت اللہ خاں
پیدائش	: 01/جون 1916ء، پٹنہ
ملازمت	: محکمہ پی. ڈبلیو. ڈی (حکومت بہار)
آغاز شعر گوئی	: 1949ء
شاعری میں اساتذہ	: منظرؔ عظیم آبادی، ثاقبؔ عظیم آبادی اور پرویزؔ شاہدی
پہلا شعری مجموعہ	: نغمۂ سنگ 1988ء
دوسرا شعری مجموعہ	: شاخ زیتون 1998ء
انعامات و اعزازات	: بہار اردو اکیڈمی 85-1984ء
	: محکمہ راج بھاشا (حکومت بہار) 86-1985
تلاشِ معاش	: 1946ء میں تلاش معاش کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر
پارٹی سے وابستگی	: 1952ء میں سی پی آئی سے وابستگی
پہلا کل ہند مشاعرہ	: سیوان، بہار میں منعقد کل ہند مشاعرے میں پہلی دفعہ شرکت

کلکتہ سے واپسی	: 1956ء میں کلکتہ سے پٹنہ کی مستقل واپسی، اسی سال جشن کشمیر میں شرکت کے لیے روانگی۔
صدارت	: 1974ء میں ''انجمن محمدیہ'' بہار کے صدر منتخب ہوئے
روحانی تعلق	: 1980ء میں خانقاہ ایوبیہ، نیولی شریف غازی پور سے روحانی وابستگی
ملازمت سے سبکدوشی	: 31/مارچ 1991ء کو ملازمت سے سبکدوشی
وفات	: 15/جنوری 1997ء کی صبح میں

رمزؔ عظیم آبادی: حالات زندگی

تاریخ ادب اردو کے صفحات اس بات کے شاہد ہیں کہ دبستانِ عظیم آباد نے ایک سے بڑھ کر ایک نامور اور مایہ ناز ادبا وشعرا پیدا کئے اور ان ادبا وشعرا نے نہ صرف صوبہ بہار؛ بلکہ پوری اردو دنیا میں اپنی شہرت وعظمت کا سکہ چلایا۔ رمز عظیم آبادی بھی اسی دبستان کے گہر کمیاب ہیں اور ان کی شاعرانہ حیثیت کا آج ایک زمانہ معترف ہے۔ انھوں نے نہایت ہی ناموافق اور نامساعد حالات میں شاعری شروع کی۔ راہ میں ہزار مشکلیں آئیں؛ لیکن وہ مسلسل آگے بڑھتے گئے اور بالآخر ایک ایسا وقت آ ہی گیا، جب انھیں دنیا نے بطور ایک معروف اور منفرد شاعر کے تسلیم کرلیا۔

رمز عظیم آبادی (اصل نام رضا علی خاں) یکم جون 1916 عیسوی کو پٹنہ سیٹی، پٹنہ کے سنار ٹولی محلّہ (اب معشوق علی خان لین) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام قدرت اللہ خاں اور والدہ کا نام ملکہ بیگم تھا۔ ان کی دو شادیاں ہوئیں: پہلی بیوی چندہ خاتون تھیں، چندہ خاتون سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ ان کے دونوں بیٹے منورالہدیٰ اور شمس الہدیٰ اب حیات سے نہیں رہے۔ بیٹیوں میں نزہت صبا حیات ہیں، جب کہ حسنیٰ بانو وفات پا چکی ہیں۔

منورالہدیٰ سے کوئی اولاد نہیں تھی، جب کہ شمس الہدیٰ مرحوم سے چار لڑکیاں اور ایک لڑکے تھے۔ ان کی بیٹی نزہت صبا سے چھ لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ حسنیٰ بانو مرحومہ سے بھی تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔

رمز کی دوسری زوجہ حسینہ خاتون ہیں، جن سے دو بیٹیاں ہیں: پہلی بیٹی یاسمین فرخ (حیات) ہیں، جن سے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، جب کہ دوسری بیٹی تحسین فرخ سے کوئی اولاد نہیں ہے۔

رمز عظیم آبادی مرحوم کے والدین کی مالی حالت بہت ہی خستہ تھی؛ اس لیے رمز کو تعلیم وتعلم کے ساتھ بہت سی ضروری سہولتوں سے محروم رہنا پڑا؛ لیکن خدا نے انھیں بہت سی خوبیاں ودیعت کی تھیں اور انھیں خصوصیات کی بنا پر وہ آگے چل کر اردو شاعری کے میدان میں ایک نمایاں حیثیت کے حامل ہوئے۔ ان کے حالات زندگی کے متعلق پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اپنی کتاب ''بہار کی بہار'' میں لکھا ہے کہ:

''والدین کی مالی حیثیت بھی ایسی نہیں تھی کہ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوا سکتے؛ اس لیے رمز نے ابتدائی تعلیم گھر پہ حاصل کرنے کے بعد آزادانہ مطالعہ کو راہ دی....''۔

(''بہار کی بہار''، ص:97)

اس ضمن میں معروف افسانہ نگار احمد یوسف مرحوم نے بھی ان کے حالات زندگی پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ ان کا گھریلو پس منظر بہت ہی ناموافق تھا، پھر بھی انھوں نے اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت ادب میں اپنا مقام مستحکم کیا۔ ان کے مطابق:

''رمز عظیم آبادی انتہائی غریب گھرانے میں پیدا ہوئے، جب ذرا بڑے ہوئے تو کہاں کی تعلیم اور کہاں کا مدرسہ، بس مزدوری پر لگا دیئے گئے؛ لیکن جب سنِ شعور کو پہنچے تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں بیاض تھی اور ان کا کلام تیزی سے عوام میں مقبول ہوتا جا رہا تھا.... انھوں نے کبھی کوئی باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی؛ لیکن ان کے کلام میں جو تعمق ہے، جو گہرا کلاسکی رچاؤ ہے، اُسے دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہ اکتسابی نہیں وہبی ہے''۔

(احمد یوسف ... ''شاخ زیتون''، ص:21)

رمز کو خدا نے دولت نہیں دی تھی، بڑی بڑی یونیورسیٹیوں کی سندیں بھی نہیں دی تھیں؛ مگر ان کو شہرت اور مقبولیت کا بیش قیمت تحفہ ضرور عطا کیا تھا۔ رمز کے پاس نہ باضابطہ تعلیم تھی اور نہ ہی خانگی حالات شعر وشاعری کے موافق تھے اور اوپر سے ایک مسئلہ یہ کہ وہ ابتدائی زمانے سے ہی مالی مشکلات اور پریشانیوں سے نبرد آزما تھے؛ لیکن چوں کہ قدرت نے ان کے اندر ایک بڑے فنکار کو رکھا تھا؛ اس لیے وہ تمام مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود اس میدان میں آئے اور پھر شہرت وعزت کے اعلیٰ مقام تک پہنچ کر ہی دم لیا۔

عام طور سے ادب میں یہ دیکھا گیا ہے کہ بڑی بڑی صلاحیتوں اور ذہانتوں کے مالک بھی خستہ حالی اور مالی دشواریوں کے سبب ادب میں زیادہ دور تک نہیں جا سکے اور حالات کے آگے

سپر ڈال کر دوسری راہ پر نکل پڑے۔ ادب میں ایک ایسے طبقے کا بھی سراغ ملتا ہے، جو تعلیم یافتہ بھی ہوتا ہے، خوشحال بھی ہوتا ہے اور موافق ماحول میں پلا بڑھا بھی ہوتا ہے؛ مگر قدرت کی طرف سے اسے ذوق وشوق اور طبع موزوں نصیب نہیں ہوتا؛ اس لیے بہت کوشش اور مغز پاشی کے باوجود وہ ادب میں کوئی مقام حاصل نہیں کر پایا۔ میری دانست میں طبع موزوں اور شعری ذوق وشوق قدرت کا ایسا خاص عطیہ ہے، جو کسی کسی کو ہی ملتا ہے۔

رمزؔ عظیم آبادی مرحوم پر قدرت کا خاص لطف وکرم تھا، حالانکہ وہ بدحال تھے اور معاشی تنگی کے سبب انھیں محنت مزدوری بھی کرنا پڑی، کچھ دنوں تک رکشہ بھی کھینچنا پڑا، پھر بھی وہ تھے آرٹجینل فنکار۔ اردو ادب میں شاید یہ پہلا واقعہ ہے کہ کسی رکشہ کھینچنے والے شاعر نے آگے چل کر ادب کے بڑے بڑے ایوانوں میں کرسی نشینی کی ہو اور اپنے عہد کے رؤسا اور امرا کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہو۔ فقیری میں شاہی کی مثال رمزؔ پر بھی صادق آتی ہے۔

رمزؔ عظیم آبادی کے ابتدائی اور آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے ان کے ہم عصر شاعر احمد تبسم نے لکھا ہے کہ:

> ’’رمزؔ کی زندگی کے روشن پہلو بھی ہیں اور تاریک بھی، میں نے اسے اس وقت دیکھا، جب وہ صرف رمضانی رکشہ والا تھا۔ وہ زمانہ 47-1946 عیسوی کا رہا ہوگا۔ صدر گلی (پٹنہ سیٹی) موڑ پر وہ گنجی اور ہاف پینٹ میں اکثر نظر آتا تھا۔ اس کی شکل اپنی ماں سے بہت ملتی جلتی تھی، بالکل سیاہ فام۔ ماں اسے بہت مانتی تھی۔ اکثر وہ بھی رکشہ پڑاؤ کے سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھی رہتی تھی۔ وہ ڈانٹ ڈانٹ کر اسے بھگاتا تھا اور کہتا تھا کہ جاؤ، گھر جاؤ، تم میرے پیچھے کیوں چلی آتی ہو‘‘۔
>
> ’’.... رکشہ پر بیٹھا وہ اکثر کتاب پڑھتا رہتا تھا۔ ہم لوگوں کو یہ منظر دیکھ کر حیرت ہوتی تھی‘‘۔

(’’رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن‘‘، ص:104-103)

رکشہ چلانے کے باوجود انھیں پڑھنے کا بہت شوق تھا اور انھوں نے معروف فکشن نگار غیاث احمد گدی کی طرح بہت کم وقتوں میں ذاتی مطالعے سے بہت کچھ حاصل کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ رمزؔ رکشہ پر بیٹھے بیٹھے افسانہ، ناول، شاعری اور دوسرے فنون کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ اس مطالعے کے شوق نے رمزؔ کو ادب کے قریب کرنے میں حد درجہ معاونت کی؛ لیکن مالی مشکلات ایسی تھیں کہ پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھیں۔ ان کی حالت زار ہر کس وناکس پر عیاں تھی۔ اس دوران اس گوہر آبدار کی زبوں حالی پر ایک

خداترس اور ادب دوست شخصیت جناب عبدالقیوم انصاری مرحوم (اس وقت حکومت بہار کے وزیر) کی نظر پڑی، انھوں نے اپنے محکمہ پی ڈبلیوڈی میں انھیں نوکری دلوادی؛ مگر چوں کہ وہ سند یافتہ نہیں تھے؛ اس لیے اچھی نوکری نہیں ملی، پھر بھی مستقل آمدنی کا ذریعہ پیدا ہونے سے ان کو کچھ راحت ضرور ملی۔

رمزؔ نے تمام عمر ناکامیوں سے کام لیا، کبھی حوصلہ نہیں چھوڑا اور نہ کبھی احساس کمتری کا شکار ہوئے۔ وہ پوری زندگی تلاش معاش اور غم روزگار کے درمیان اپنے اس ادبی مقام اور مرتبے کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے، جسے قدرت نے ان کی مقدر میں بہت پہلے ہی لکھ دیا تھا۔ رمزؔ کو زندگی کے کئی رنگ دیکھنے پڑے۔ ایسے ایسے مرحلوں سے گزرنا پڑا کہ کوئی دوسرا ہوتا تو راہ میں ہی اس کی سانس ٹوٹ جاتی۔ ان کے دگرگوں حالات اور ان کی ادبی سرگرمیوں کے متعلق طنز وظرافت کے معروف شاعر رضا نقوی واہی مرحوم نے لکھا ہے کہ:

> ’’.... روٹی کی طلب انھیں کلکتے کھینچ لے گئی، جہاں وہ ہاتھ رکشہ کھینچ کر کسبِ معاش کرتے رہے۔ شعر وادب سے فطری لگاؤ کے باعث پرویز شاہدی اور رضا علی وحشتؔ کی شعری محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔ ترقی پسندانہ ماحول کی طرف رغبت ہوگئی؛ لیکن کلکتے کی سخت زندگی انھیں راس نہ آئی تو وہاں سے پٹنہ آگئے اور یہاں کی شعری محفلوں اور مشاعروں کے روح رواں بن گئے.... اردو شاعروں کی معاشی بدحالی کی داستان سے کون واقف نہیں۔ احسان بن دانش کسبِ معاش کے لیے مزدوری کیا کرتے؛ لیکن اپنے وقت کے ایک باکمال شاعر بھی تھے۔ رمزؔ کی شاعرانہ عظمت کو دیکھتے ہوئے اس وقت کے ایک علم دوست وزیر جناب عبدالقیوم انصاری مرحوم نے محکمہ تعمیرات میں انھیں ایک چھوٹی سی ملازمت دلوادی، جس کی وجہ سے رمزؔ مرحوم کو تھوڑی راحت نصیب ہوئی....‘‘۔

(’’شاخ زیتون‘‘، ص:22)

رمزؔ کی کتاب زندگی کے صفحات الٹنے پلٹنے پر معلوم ہوتا ہے کہ انھیں زندگی میں تھوڑی بہت راحت ملی بھی تو اکثر بے قراری ہی رہی۔ خاندانی پس منظر کمزور ہونے کی وجہ سے انھیں پوری زندگی جدوجہد کرنی پڑی، عیش عشرت اور فارغ البالی کی زندگی سے ہمیشہ محروم رہے؛ لیکن قدرت نے انھیں بہت غیور بنایا تھا۔ وہ مشکل حالات میں بھی ٹوٹے نہیں، کسی کے آگے دستِ طلب دراز نہیں کیا۔ ایک طرف جہاں رمزؔ عوام اور خواص کے طبقے میں مقبول تھے تو دوسری طرف ایک طبقہ ایسا بھی تھا، جو انھیں کم تر اور بے وقعت سمجھتا تھا اور انھیں اکثر نظر انداز کرتا رہتا تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ ان کی موت کے

بعد بہار کے کسی رسالے نے ان پر نہ کوئی گوشہ شائع کیا اور نہ ہی ان کی خدمات کے اعتراف میں کوئی قدم اٹھایا۔ مرحوم ہارون رشید، سابق ورکنگ چیئرمین اقلیتی کمیشن، حکومت بہار کے مطابق یہ ان کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی تھی۔ اگر اس قسم کا شاعر بہار کے علاوہ دوسرے صوبے، یا ملک میں پیدا ہوتا تو یقیناً اس کی شہرت اور عظمت میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے جاتے۔ ہاں! اس معاملے میں یہاں رمز کے شاگردوں کا اعتراف لازم ہے کہ انھوں نے حقِ شاگردی ادا کی اور حتی المقدور اپنے استاد کی شاعرانہ حیثیت و عظمت کو عام کرنے میں بھرپور دلچسپی لی۔

رمز عظیم آبادی ایک سادہ لوح مخلص اور سچے انسان تھے۔ وہ جس کو چاہتے تھے دل و جان سے چاہتے تھے اور اکثر اس کا ذکر ہر محفل میں کیا کرتے تھے۔ عبدالقیوم انصاری ان کے محسن تھے۔ وہ اکثر دل کھول کر ان کے تئیں اپنی احسان مندی کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ دوسرے سیاست دانوں میں وہ شمائل نبی صاحب سے بہت قریب تھے۔ شمائل صاحب مرحوم ان کو اپنا بہترین دوست مانتے تھے۔ انہی کی کوششوں سے وزیر اعلیٰ بندیشوری دوبے نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں محکمہ راج بھاشا کے انعام و اعزاز سے نوازا۔

شمائل نبی نے رمز صاحب کی سادہ لوحی، ان کے اپنا پن اور ان کی بے پناہ دوستی کو یاد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''1986-87 عیسوی کے درمیان وہ ایک دن میرے ہارڈنگ روڈ والے سرکاری مکان پر آ گئے اور وہیں مقیم رہے۔ میں اس وقت سیاسی دورہ پر تھا، جب میں گھر لوٹا تو میری ان سے ملاقات ہوئی، اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے، میں نے ان سے کہا: ''اتنی رات گئے آپ یہاں؟'' تو انھوں نے مجھ پر اپنے حق کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''آج کل میں اسی مکان میں رہتا ہوں'' میں نے ان سے کہا: ''ہاں! یہ آپ ہی کا مکان ہے شوق سے رہیے'' وہ رمضان کا مہینہ تھا۔ میں نے دیکھا جام و سبو، صراحی، مئے اور میکدہ کی بات کرنے والے رمز پابندی سے روزے رکھ رہے تھے، وہ میرے یہاں تقریباً دو ماہ رہے، اس مدت میں ہماری دوستی محبت کے ایسے رشتوں میں تبدیل ہوگئی کہ وہ میری بیٹی اور بیٹوں کو اپنے بچوں کی طرح ماننے لگے...۔''

(''شاخ زیتون''، ص:28)

مندرجہ بالا اقتباس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رمز کس قدر کشادہ قلب تھے۔ وہ دوستوں کو کتنا چاہتے تھے اور بغیر کسی تکلف اور جھجک کے ان پر اپنا حق بھی جتاتے تھے۔

رمز صاحب نے چوں کہ محنت مزدوری بھی کی تھی؛ اس لیے وہ جہاں مزدوروں کے ناگفتہ بہ حالات سے بخوبی واقف تھے، وہیں وہ مالداروں اور سرمایہ داروں کی بے حسی اور ان کی بے رحمی کا بھی تلخ تجربہ رکھتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کے اندر ایک ردعمل کا شدید جذبہ بھی پایا جاتا تھا۔ ابتدائی زمانے میں وہ حد درجہ انقلابی تھے اور کسی طرح کے رسوم و قیود سے آزاد تھے، جیسا کہ عرض کیا گیا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رکن بھی تھے۔ اس کا سبب وہی ان کا ردعمل تھا۔ انھوں نے حالات کے اتنے تھپیڑے کھائے تھے کہ ذہنی طور پر باغی ہوگئے تھے۔ انھوں نے سماج کے بنے بنائے اصولوں اور ضابطوں سے انحراف کیا اور اپنے لیے ایک نئی راہ تلاش کی۔ انھوں نے اپنے سینئر شعرا سے مشورۂ سخن تو کیا؛ لیکن باضابطہ کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ پروفیسر علیم اللہ حالی کے مطابق:

''ان کے ذہنی و تخلیقی رویے کے نشانات پایا، جسے یگانہ چنگیزی، شاد عارفی، احسان دانش، پرویز شاہدی اور حسن نعیم وغیرہ کے طرز فکر میں تلاش کئے جا سکتے ہیں، ایک جھنجھلاہٹ، ہلکی سی ضد، ذاتی اور نجی محرومیوں کا شدید احساس، ایک جدلیاتی تیور، اپنے عہد سے برافروختگی، سب سے ہٹ کر چلنے والی ہٹ اور ہمت۔ یہ خصوصیات ان تمام فن کاروں میں مشترک ہیں''۔

(''رمز عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، منصوبہ و تحقیق: محمد شمس الحق، ص:31)

رمز عظیم آبادی ایک حساس اور باخبر فن کار تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں انھیں احوال کو شعری قالب میں ڈھالا، جن کا انھوں نے براہِ راست تجربہ کیا، یا ان کے اثرات ان تک پہنچے۔ درج بالا سطور میں ان کے خاندانی حالات کا ذکر ہوا ہے اور عرض کیا گیا ہے کہ ان حالات نے انھیں کس قدر متاثر کیا؛ لیکن رمز ایک کھلا ذہن رکھنے والا فنکار تھا؛ اس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ملکی اور بین الملکی احوال سے بے خبر رہتا۔ رمز کی شاعری کا ابتدائی دور ملکی اور بین الملکی طور پر بہت ہی ہنگامہ خیز تھا۔ ملک نیا نیا آزاد ہوا تھا۔ ہجرتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ساتھ ہی خونیں واردات اور قتل و غارت گری کی خبریں بھی آ رہی تھیں۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں بچ گئے مسلمانوں کے لیے بہت ہی سخت اور سنگین حالات پیدا ہوگئے تھے۔ مسلمان نہ آزادی کا جشن منا سکتا تھا اور نہ تقسیم کا سوگ۔ وہ اس وقت بھی ملک کے شہری تھے؛ لیکن اب ان کی حیثیت بدل چکی تھی، انھیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا تھا۔ ایک غیریت اور اجنبیت کا ماحول اچانک نمودار ہو کر سامنے آ چکا تھا۔ اس وقت جو مالدار تھے، وہ تو کچھ حد تک محفوظ اور مستحکم رہے؛ لیکن جو مالی اعتبار سے کمزور اور تنگ دست تھے، ان کا حال بیان سے باہر تھا۔ ایک طرح سے یکا یک یہ ملک ان کے لیے اجنبی اور غیر محسوس ہونے لگا۔ رمز

کاتعلق اسی ثانی الذکر طبقے سے تھا۔ رمزؔ نے ان بدلی ہوئی صورتحال کا غائر مشاہدہ کیا۔ حصول آزادی اور تقسیم ملک کے بعد بین الاقوامی سطح پر برپا ہونے والے خلفشار اور دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کا شدت سے اثر لیا۔ انھوں نے اعلیٰ سطح پر انگریزوں کی ہزیمت دیکھی اور ایشیائی عوام کو حالت زار سے باہر نکلتے دیکھا۔ غرض کہ ان تمام ملکی وغیر ملکی عوامل نے ان کی شخصیت اور شاعری پر گہرا اثر ڈالا۔

ڈاکٹر امتیاز احمد کے مطابق:

''ان ہی محرکات نے ان کی فکر کو جلا بخشنے کا کام کیا اور ان کی شاعری کے لیے مواد کا کام کیا''۔

چناں چہ ان کی شاعری جن موضوعات کا احاطہ کرتی ہے، ان میں حب الوطنی اور جذبۂ آزادی ہے، قومی قائدین ہیں، ہندوستان کی رنگارنگ تہذیب اور حسن قدرت ہے، جنگ کی مخالفت ہے، عظمت انسان اور انسان دوستی کی قدریں ہیں، سرمایہ داری اور سامراجیت کی مخالفت ہے، فنکار کی عظمت اور خودداری ہے، فرقہ پرستی کی مذمت ہے، اشتراکی فکر ہے، ترقی پسندی کے اثرات ہیں اور ذاتی زندگی کی محرومی اور اس سے ابھرنے کا حوصلہ ہے۔

ڈاکٹر امتیاز احمد کے مطابق:

''ان موضوعات کا احاطہ کرتی ہوئی ان کی بہت سی نظمیں بہت مقبول ہوئیں جو کہ آج ان کے دونوں شعری مجموعوں میں شامل ہیں''۔

(''رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، ص: 58-57)

رمزؔ کے خاندانی پس منظر اور سماجی حالات پر غائر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ملک میں پھیلے خلفشار ظلم و استبداد، قتل و غارت گری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ساتھ ہی سرمایہ دارانہ نظام کے استحصالی اور استبدادی رویے کو بھی گہرائی سے محسوس کیا، بھوگا۔ ظاہر ہے وہ ایک حساس فن کار تھے اور انھیں ان عوامل کا اثر لینا ہی تھا۔ انھوں نے اس صورتحال کے خلاف جم کر، بے خوف ہو کر اپنی شاعری اور بالخصوص نظموں میں اظہار کیا؛ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہی احتجاجی رویہ ان کی شاعری کی اصل پہچان بن گیا۔ رمزؔ رواداری اور بھائی چارے کو ملک کی ترقی اور سالمیت کے لیے ازحد لازمی تصور کرتے تھے؛ اس لیے انھوں نے اپنی نظموں میں متعدد مقامات پر فرقہ واریت اور مذہبی منافرت کو ہدفِ ملامت بنایا اور ان لوگوں کو آڑے ہاتھوں لیا، جو سیاسی مفاد کی خاطر معاشرے میں زہر پھیلانے کا کام کرتے اور فسادات کی آگ میں ہاتھ سینکنے کے متمنی رہتے ہیں۔

رمزؔ کی زندگی متضاد کیفیات و نظریات سے عبارت ہے۔ کبھی وہ رمضانی ہوئے اور ماہِ

رمضان کی فضیلت بیان کرتے ہوئے نظر آئے تو کبھی اشتراکی ہو گئے اور مارکسی افکار کی پیروی کرنے لگے۔ کبھی دین سے متنفر ہوئے تو کبھی اس کا حد درجہ احترام کرتے ہوئے نظر آئے۔ رمزؔ کی شاعری کا آغاز ہی رمضانی کلام کی تخلیق سے ہوا۔ سلطان آزاد کے مطابق رمزؔ عظیم آبادی نے 1947 عیسوی میں رمضانی کلام لکھنا شروع کیا اور آگے چل کر 1949ء سے وہ باضابطہ شاعری کے میدان میں اتر آئے اور اپنا سب سے پہلا کلام لودی کٹرہ، پٹنہ سیٹی کے ایک طرحی مشاعرے میں پیش کیا۔ اس مشاعرے کا مصرعہ طرح تھا۔ ''کہاں کہاں لیے پھرتی ہے جستجو تیری'' اور اس طرح وہ رفتہ رفتہ اپنی شاعری کے توسط سے شہرت کی اونچائیاں چھونے لگے؛ لیکن یہ بات یہاں واضح ہو کہ قافلہ سحری کے لیے جس نیک نیتی سے انھوں نے رمضانی شاعری شروع کی، اس کی برکت نے انھیں آگے چل کر پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ اس زمانے میں اکثر شعرا روزہ داروں کو بہ وقت سحر بیدار کرنے کے لیے نہ صرف کلام لکھتے تھے؛ بلکہ خود بھی اپنے قافلوں میں شریک ہوئے تھے۔ اس زمانے میں قافلہ سحری کا رواج نہ صرف بڑے شہروں میں؛ بلکہ چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی تھا۔ یہ قافلے تیس دنوں تک اپنے اپنے علاقوں میں ماہِ رمضان اور روزے کی فضیلت پر مبنی کلام پڑھتے ہوئے گزرتے تھے اور روزہ داروں کو بیدار کر کے آگے بڑھتے تھے۔ نیز رمضاان کے اختتام؛ یعنی عید کے فوراً بعد ان قافلوں کا آپس میں مقابلہ ہوتا تھا۔ کلام کے معیار اور اس کی بہترین ادائیگی کے لیے مقابلے کی محفل میں انھیں اوّل، دوم، سوم انعامات سے نوازا جاتا تھا۔ یہ مقابلہ اس وقت بہار کے تقریباً ہر شہر میں منعقد ہوتا تھا۔ جب رمضانی کلام اور شعرا کا چرچا عام ہونے لگا تو بہت سے ایسے شعرا بھی اس میدان میں آ گئے، جو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ انھیں ثواب نہیں شہرت کی چاہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعرا کے درمیان چشمکیں جاری ہوئیں اور یہ بڑھتے بڑھتے رقابت تک پہنچ گئیں، یہاں بھی گروپ بازی اور گروہ بندی ہونے لگی۔ رمزؔ نے جس جوش اور عقیدت سے رمضانی شاعری کا آغاز کیا اور قافلہ سحری میں تندہی کے ساتھ شریک ہوئے، وہ جوش رفتہ رفتہ ماند پڑنے لگا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے سید ناصر حسین زیدی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

''رمزؔ نے ماہِ مبارک کے بعد تمام قافلہ سحری کے ایک اجتماعی جلسہ اور تقسیم انعامات کا سلسلہ قائم کیا۔ پہلے تو کوشش یہ ہوئی کہ عید کے روز ہی شب میں یہ تقریب انجام پائے؛ لیکن بعض دشواریوں کے پیش نظر عید کے دوسرے دن یہ جلسہ ہونے لگا۔ اس جشن سے قافلہ والوں کو کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہوئی کہ عظیم آبادی کے مقامی قافلوں کے

علاوہ بہار شریف، حاجی پور وغیرہ کے قافلے بھی شریک مقابلہ ہونے لگے۔ چند برسوں تک یہ سلسلہ چلا؛ مگر اس کی شہرت، نیک نامی اور کامیابیوں کو دیکھ کر موقع پرستوں کے منہ میں پانی آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گروپ بازی اور فتنہ انگیزی شروع ہوگئی۔ رمز نے حصول ثواب کے لیے یہ سلسلہ نیک نیتی اور خلوص دل سے قائم کیا تھا؛ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ باہمی نزاع کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے تو خود کو علاحدہ کرلیا....''۔

(''رمز عظیم آبادی: شخصیات اور فن''، ص:70)

رمز عظیم آبادی کو پوری زندگی اس بات کا احساس رہا کہ وہ معاشرے میں سماجی اور مالی اعتبار سے کمزور اور کمتر ہیں اور اکثر لوگ انھیں تحقیر اور استہزا کی نظر سے دیکھتے ہیں؛ مگر اس احساس نے انھیں پژمردہ اور مایوس نہیں کیا؛ بلکہ ان میں ہمت اور جوش کا جذبہ بھر دیا اور انھوں نے حتی المقدور ان تمام کمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی، جو ان کی راہ کی رکاوٹ تھیں۔ اس ضمن میں انھوں نے خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں منعقد اپنے نام سے منسوب ایک پروگرام میں اپنے متعلق بہت ہی اہم اطلاعات فراہم کیں۔ ملاحظہ کریں:

''.... جس چیز نے ہمیں بہت دور رکھا، وہ صحیح معنوں میں غربت ہے اور اس کے ساتھ میرے پاس کوئی سارٹیفیکٹ نہیں ہے کسی کالج، کسی اسکول کی۔ نوکری تو ہم کو مل گئی تھی؛ مگر ان لوگوں نے اپنی طاقت سے نوکری دلوائی تھی مجھے، طاقت سے.... سارٹیفیکٹ میرے پاس نہیں ہے۔ رہ گیا مطالعہ کا شوق تو اس وقت بھی تھا اور شاید آج بھی، اس وقت تک اور شاید ہم سمجھتے ہیں کہ بستر مرگ سے جب تک آنکھ میں دم ہے، دم رہے گا، ان شاء اللہ ہم مطالعہ ہی میں رہیں گے.... اس لیے کہ جنون کی حد تک مجھے کتابوں کا شوق.... اور احسان بھی کتابوں کا کہ جس نے ہمیں بنایا ہے، ورنہ وہ آدمی جس نے کبھی اسکول کا منہ نہیں دیکھا ہو، وہ جب ایسے شعر کہتا ہے تو لوگ شبہ کرتے تھے کہ یا تو جمیل مظہری صاحب نے دے دیا ہے، یا پرویز شاہدی نے، یہ الزام بہت دنوں تک رہا اور یہ الزام اس وقت ختم ہوا، جب یہ دونوں حضرات نہیں رہے، ورنہ اگر ہم نے اس طرح کا شعر کہا کہ:

پہچانتا ہوں رمز مزاج دعا کو میں
بہلا رہا ہے مجھ کو خدا اور خدا کو میں

''31 جنوری 1992ء کی شام منعقدہ اس شام کے روحِ رواں خدا بخش

لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار تھے اور اس میں شہر کے متعدد ادبا، شعرا اور دانشوران میں ڈاکٹر بیدار کے علاوہ کامریڈ حبیب الرحمٰن، فرید پربتی، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، کیف عظیم آبادی، مظہر امام، صدیق مجیبی، ہارون رشید، بہزاد فاطمی، صابر آروی، فخر الدین عارفی، فیاض الرحمٰن شارق، صفدر امام قادری، ابوبکر رضوی اور احسن راشد وغیرہ کے علاوہ خود رمز صاحب بھی موجود تھے''۔

(''رمز عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، منصوبہ و تحقیق: محمد شمس الحق، ص:75)

رمز عظیم آبادی کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ حصول علم کے لیے کسی عمر کی قید کو لایعنی سمجھتے تھے۔ انھیں جس چیز کا علم نہیں تھا، اسے دوسروں سے معلوم کرنے اور سیکھنے میں انھیں کوئی عار نہیں تھا۔ وہ مرحوم عطا کاکوی صاحب کی علمیت کا سرِ عام اعتراف کرتے تھے اور انھیں ایک بحر ذخار تسلیم کرتے تھے۔ رمز صاحب نے ان کی صحبت میں فارسی شعرا کے متعلق بہت کچھ معلوم کیا اور بہت کچھ سیکھا۔ سید انیس الرحمٰن کے مطابق ایک دفعہ رمز صاحب نے ان سے پوچھ لیا کہ یہ مارکسزم کیا ہے؟ اور جدلیاتی مادّیت کس کو کہتے ہیں؟ جس کے جواب میں انھوں نے رمز صاحب سے کہا کہ یہ میرا موضوع نہیں ہے اور انھیں ایک کتابچہ تھما دیا، جس میں ان موضوعات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی تھی۔ یہی نہیں، وہ اردو کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں کے معروف شعرا کے متعلق بھی واقفیت حاصل کرنے کے ہمیشہ متلاشی رہتے تھے۔ رمز صاحب کو جاننے اور سیکھنے کا شوق اور لگن حد درجہ تھا، وہ جانتے تھے کہ اس عمر میں مطالعہ سے بہت کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا؛ اس لیے اہل علم سے کسبِ فیض کرنا از حد لازمی ہے اور وہ یہ کام عمر کے آخری لمحے تک کرتے رہے۔

رمز کی حیات کے کئی رنگ اور گوشے ہیں۔ میں نے ابتدا میں عرض کیا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے اور اشتراکیت سے قریب تھے؛ لیکن ساتھ ہی وہ خدا اور اس کی وحدانیت پر بھی یقین کامل رکھتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک معصوم اور سیدھے سچے انسان تھے، جو دل میں ہوتا تھا، وہی زبان پر بھی ہوتا تھا۔ سید انیس الرحمٰن نے اپنے اسی مضمون میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ:

''ایک موقع پر آئے تو دیکھا کافی سست تھے، داڑھی بڑھالی تھی، ہم نے کہا: ماشاء اللہ! حضرت کوڑا شاہ کا فیضان تو نمایاں ہو رہا ہے، بات کاٹ دی اور کہنے لگے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے، اپنی زندگی کچھ عجیب گزری ہے، گناہوں سے دبا ہوا ہوں، پتہ نہیں آخرت کیسے گزرے گی، نجات ہوگی کہ نہیں.... ہم نے ان کو غور سے دیکھا، وہ واقعی مضطرب تھے۔ ہم نے ان کو ڈھارس بندھائی کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوئیے، اپنے

ایمان کو مضبوط کیجیے، خوب استغفار پڑھیے، کلمہ پڑھیے، نمازیں پڑھیے اور درود شریف کثرت سے پڑھیے نجات مل جائے گی اور آخرت اچھی گزرے گی‘‘۔ (ان شاء اللہ)

(’’رمزؔ عظیم آبادی ملاقاتوں کی روشنی میں‘‘، ’’رمزؔ عظیم آبادی شخصیت اور فن‘‘، ص:120-117)

درج بالا اقتباس سے معلوم ہوا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی سے منسلک تو ہوئے؛ لیکن کمیونسٹ مینی فیسٹو کے تابع نہیں ہوئے۔ یہ ان کے مزاج کی بات تھی کہ غربت اور سماجی نابرابری کے خلاف لکھتے تھے؛ لیکن بنیادی طور پر وہ ہر طرح کی تحریک اور ازم سے دور تھے۔ وہ ادیبوں اور شاعروں کو آزاد خیال اور حق پسند ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی اس فکر اور سوچ کی جھلک ان سے لیے گئے ایک انٹرویو میں صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہ انٹرویو ان کے شاگرد اور اردو ہندی کے سرکردہ شاعر پریم کرن (پٹنہ) نے 1980 عیسوی میں لیا تھا۔ یہاں پیش ہے مذکورہ انٹرویو کا ایک حصہ۔ اس میں انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا ہے کہ:

’’.... میں 1952 عیسوی تک سی پی آئی سے جڑا رہا؛ مگر میں اس وقت بھی اور آج بھی ادب کو کسی پارٹی کا آرگن (Organ) بنانے کا قائل نہیں۔ اگر کوئی ادیب، یا شاعر کسی پارٹی کا پابند ہوجاتا ہے تو پھر اس کا ادب پارٹی مینی فیسٹو ہوگا ہی۔ مثال کے طور پر مرحوم پرویز شاہدی کو لیجیے، اتنا اچھا شاعر، اتنا خوش فکر، پختہ کار؛ مگر ان کی تثلیث حیات اٹھا کر دیکھیے پارٹی پروپگنڈا کے سوا اور کچھ نہیں (چند کو چھوڑ کر)۔ یہی حالت سردار جعفری، کیفی، مجروحؔ اور تاباں کی بھی ہے، ان لوگوں کا ایک بھی شعر آفاقی نہیں ہے، حالانکہ یہ شعرا آفاقی ادب کے قابل تھے۔ فراقؔ نے ترقی پسند ادب سے ہمدردی تو رکھی؛ مگر اپنی غزل کو اس سے بالکل الگ رکھا۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ فراقؔ کے یہاں سینکڑوں اشعار آفاقی مل جائیں گے؛ اس لیے شاعروں اور ادیبوں کو پارٹی سے ہمدردی تو رکھنی چاہیے؛ مگر ادب کا دامن ملوث نہ کریں، میں نے بھی یہی کیا‘‘۔

(’’رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن‘‘: منصوبہ و تحقیق۔ محمد شمس الحق۔ ص:48-147)

نوٹ: یہ انٹرویو ہندی میں تھا، جسے اس کتاب کے مرتب محمد شمس الحق نے اردو میں ترجمہ کیا۔

رمزؔ عظیم آبادی مرحوم کی اس وضاحت کے بعد انھیں اشتراکی کہنا کسی طرح جائز نہیں معلوم ہوتا، جیسا کہ عرض کیا گیا رمزؔ باضابطہ تعلیم یافتہ نہیں ہونے کے باوجود کبھی بھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنی اس کمی کو دور کرنے کے لیے کتابوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ صرف شاعری ہی نہیں، انھوں نے داستانوں، ناولوں اور افسانوں کا بھی کثرت سے مطالعہ کیا۔ پریم کرن کے مطابق وہ

لوگوں سے کتابیں مانگ کر گلی کوچوں میں لیمپ پوسٹ کے نیچے بیٹھ کر مطالعہ کرتے رہے اور یہ سلسلہ کبھی ٹوٹا نہیں۔ انھیں اس بات کی قطعی فکر نہیں تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ کپڑے پھٹے ہیں تو پھٹے رہیں، بال بکھرے ہیں تو بکھرے رہیں؛ لیکن ایک پسندیدہ کتاب آ گئی تو پڑھتے پڑھتے شام کر دیتے تھے۔ ان کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ اگر کتاب کی دکان پر کوئی کتاب ان کو پسند آجاتی تھی تو وہ کسی بھی حال میں اسے ضرور خرید لیتے تھے۔ ان کے ساتھ ایسا متعدد دفعہ ہوا کہ وہ گھر سے نکلتے خانہ داری کے ضروری سامان خریدنے اور خرید لائے کتابیں! ان کی اس عادت کی وجہ سے میاں بیوی میں جھگڑے بھی ہوتے تھے؛ مگر رمزؔ دھن کے پکے تھے، وہ ہر حال میں اپنی روش پر قائم رہتے تھے۔ ان کے اس ذوقِ مطالعہ نے ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کیا اور وہ عظیم آباد کے سند یافتہ اور منصب و مرتبہ رکھنے والے شعرا و ادبا کی صحبت میں بیٹھنے اور عزت پانے کے لائق ہوئے۔

رمز کا ایک بڑا خاصہ یہ بھی تھا کہ وہ وسیع المشرب تھے۔ وہ کسی بھی بنیاد پر ادیبوں، شاعروں کے درمیان تفریق اور امتیاز نہیں برتتے تھے۔ ہندو مسلم یک جہتی اور ہم آہنگی کو وہ پسند کرتے تھے اور اس کو فروغ دینے میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں چند غیر مسلم بھی تھے، جنھیں فن عروض بتانا اور سکھانا بہت مشکل امر تھا؛ لیکن رمزؔ کا ہنر تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح عروض کی بنیادی چیزوں کو سکھا ہی دیتے تھے۔ اس سے استفادہ کر کے ان کے غیر مسلم شاگردان بہت حد تک چست درست اشعار تخلیق کر لیا کرتے تھے۔

رمزؔ عظیم آبادی کے شاگردوں میں معروف شاعر جناب معین کوثر کا بھی نام آتا ہے۔ معین کوثر نے انھیں بہت قریب سے نہ صرف دیکھا تھا؛ بلکہ ان کے عادات و اطوار، وضع قطع اور روزانہ کے معمولات سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں ان کی حیات اور ان کی شاعری پر بھرپور مضمون قلم بند کیا ہے۔ اس مضمون کا ایک حصہ یہاں ملاحظہ کریں:

’’عظیم آباد کا باشی ہونے کی وجہ سے مجھے رمزؔ عظیم آبادی کو دیکھنے کا اکثر موقع ملا۔ ایک دور ان کا وہ بھی تھا، جب جسمانی ساخت کے اعتبار سے ان کی ’’کاٹھی‘‘ پہلوانوں جیسی تھی۔ خاکی پینٹ پہننے کی وجہ سے پولس مین ہونے کا لوگوں کا شبہ کبھی کبھی یقین میں بدل جاتا تھا اور ایسا ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ رمزؔ صاحب خواجہ کلاں تھانہ میں ایک ادب شناس پولس افسر سے قربت اختیار کر چکے تھے اور شام میں پابندی سے تھانہ کے احاطہ میں بنے ہوئے چبوترے پر مذکورہ افسر کے ساتھ محو گفتگو دیکھے جاتے تھے۔ ان کے پاس بینت کا ایک ڈنڈا بھی تھا، جسے وہ اپنی سائیکل کے ساتھ باندھے رکھتے

تھے.... وہ اپنے شاگرد کیف عظیم آبادی کی سلائی کی دکان (مقابل انجینئرنگ کالج، پٹنہ) میں اکثر بیٹھا کرتے تھے.... اثنائے راہ وہ مومن منزل، عالم گنج میں بھی اکثر بیٹھا کرتے تھے، جہاں محلّہ کی دیندار شخصیت حاجی نور اور مولانا اصغر امام فلسفی وغیرہ سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ گدری بازار پٹنہ سیٹی میں واقع ہیرا جی کے جوتے کی دکان پر بھی اکثر شام استاد شاعر زارؔ عظیم آبادی سے وہ محوِ کلام دیکھے جاتے تھے۔ موصوف مراد پور پٹنہ میں ممتاز افسانہ نگار اور ''زبان و ادب'' کے ایڈیٹر جناب ش مظفر پوری کی قیام گاہ پر بھی اکثر حاضری دیا کرتے تھے.... ساتھ ہی وہ بدیع الزماں سحر عرف بِڈّو کی کراکری دکان کو بھی کبھی کبھی رونق بخشا کرتے تھے''۔

(''رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، ص: 163-162)

ان معمولات کو بیان کرتے ہوئے مضمون نگار نے دو شخصیات ہارون رشید صاحب اور شمائل نبی صاحب کا بھی خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان دونوں شخصیات نے ہمیشہ رمز صاحب کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا معاملہ رکھا اور اخیر عمر تک دوستی کا حق ادا کیا۔ ان کے علاوہ اس مضمون میں انیس الرحمٰن (آرٹ پریس سلطان گنج، پٹنہ) نامور افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی، محمد شفیع الرحمٰن شفیعؔ اور اثرؔ فریدی، ریحان صاحب، احسن راشد وغیرہ کا بھی ذکر آیا ہے، جن سے ملنا اور ادبی گفتگو کرنا ان کا روز کا معمول تھا، اس کے علاوہ ان کی بیٹھکیں چائے کی دکان، چشمے کی دکان اور کئی ہوٹلوں میں بھی ہوا کرتی تھیں۔

رمزؔ صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ حق گو اور بے باک انسان تھے۔ کبھی مصلحت سے کام نہیں لیتے تھے۔ معین صاحب کے مطابق اپنے خیال کے اظہار میں وہ اپنے مخاطب کی منہ دیکھی بات نہیں کرتے تھے۔ بات خواہ میٹھی ہو یا ترش، بڑی بے باکی سے بیان کر دیا کرتے تھے۔ یہی نہیں وہ حکومت کے بڑے بڑے ذمہ داران کے سامنے بھی حق گوئی اور بے باکی سے باز نہیں آتے تھے۔ اس کی مثال ان کی ایک نظم ''تلخیٔ صداقت'' ہے، جسے انھوں نے غالب صد سالہ برسی کے موقع پر پٹنہ یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں ایک مشاعرے (16 مارچ 1969 عیسوی) میں اس وقت کے گورنر شری نِتیا نند کے سامنے پڑھ دی۔ یہ جرأت اور بے باکی رمزؔ صاحب کی شخصیت کا اہم جز تھیں اور اکثر مقامات پر یہ دیکھنے کو مل جاتی تھیں۔

رمز صاحب کی ازدواجی زندگی ہمیشہ اتھل پتھل کی نذر رہی۔ ان کے مختصر سوانحی خاکے میں سید فیاض الرحمٰن شارق، کاظم رضا اور زبیر احمد بھاگلپوری نے سلسلے وار ان کے گھریلو احوال رقم کیے ہیں؛ لیکن رمز صاحب کی ازدواجی زندگی کے متعلق معین صاحب نے تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے

مطابق رمزؔ صاحب نے اپنی پہلی منکوحہ چندا اور ان کے بطن سے ہوئے چار اولادوں کے رہتے ہوئے بھی حسینہ خاتون سے دوسرا عقد کر لیا۔ اس کے بعد گھریلو الجھنوں سے زچ آ کر انھوں نے محلّہ کھڑا کنواں، گلزار باغ میں کئی برسوں تک رہائش اختیار کی اور اسی مکان میں دوسری منکوحہ حسینہ خاتون سے دو بیٹیاں یاسمین فرخ اور تحسین فرخ ہوئیں، اس کے بعد وہ پھر سے اپنے پرانے مکان کوڑا شاہ منزل میں واپس آ گئے، جہاں پہلی بیوی موجود تھیں۔ ظاہر ہے جب دونوں بیویاں ایک ہوئیں تو لڑائی اور جھگڑے کا سلسلہ تو شروع ہونا ہی تھا۔ ان حالات میں روز بروز تلخی میں اضافہ فطری تھا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ تلخی اپنے عروج پر پہنچ گئی اور نتیجے کے طور پر ان کی پہلی بیوی نے ان سے طلاق لے لی۔ اس تلخی کو بڑھانے میں محلّہ کے لوگوں کا بھی اہم رول رہا۔ ان حالات سے بد دل اور رنجیدہ ہو کر رمزؔ صاحب نے ایک دفعہ پھر گھر چھوڑا اور سبزی باغ، پٹنہ میں واقع پٹنہ لوجنگ میں رہائش اختیار کی۔ وہ بہت زود رنج آدمی تھے، معین صاحب کے مطابق 1978 عیسوی میں جب وہ پٹنہ لوجنگ میں قیام پذیر تھے تو انھوں نے مجھ سے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

''آپ میرے شاگرد ہیں، آپ سے اتنا سا کام نہیں ہوتا کہ مجھے اپنے مکان میں جانے کی راہ ہموار ہو جائے اور میں وہاں سر اٹھا کر رہ سکوں''۔

ان دنوں معین کوثر صاحب پٹنہ ضلع وقف کے سکریٹری تھے، انھوں نے رمزؔ صاحب کو اطمینان دلاتے ہوئے جواب دیا کہ انھوں نے تفتیش کے بعد رپورٹ بورڈ کے سپرد کر دی ہے۔ یہ سن کر وہ مطمئن ہو گئے۔

رمزؔ عظیم آبادی کہنے کو تو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ممبر تھے؛ لیکن وہ متشدد نہیں تھے، وہ جب تک اس پارٹی سے وابستہ رہے، ایک حد مقرر تھی، اس سے باہر نہیں جاتے تھے۔ پارٹی سے علاحدگی کے بعد اکثر اپنے گناہوں سے توبہ و استغفار کرتے رہتے تھے اور جمعہ کی نمازیں وہ اکثر گرہٹہ کی جامع مسجد میں ادا کرتے تھے اور عید بقرعید کی نمازیں خانقاہ منعمیہ (میتن گھاٹ) میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ متنوع مزاج اور شوق کے مالک تھے۔ گھر میں متضاد مزاج اور خلقت کے جانوروں اور چرند پرند کو پالا کرتے تھے اور ان کے لیے کھانے کا انتظام بھی اسی حساب سے کیا کرتے تھے۔

معین کوثر صاحب کے مطابق وہ اکثر سائیکل سے چلا کرتے تھے؛ لیکن جب قویٰ کمزور پڑ گئے تو ہیرو میجسٹک خرید لی۔ درج بالا سطور میں میں نے غیاث احمد گدی کا ذکر کیا ہے۔ غیاث صاحب کی طرح رمزؔ صاحب بھی آگے چل کر تنفس کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ وہ اکثر جاڑے کے موسم میں اس مرض کے چپیٹے میں آ جایا کرتے تھے، چناں چہ وہ شاگرد رشید کے مشورے پر وہ ہینگ

اور لہسن کا استعمال کرتے تھے۔

رمز صاحب اپنی سادگی، خلوص اور اپنا پن کے سبب سماج کے ہر طبقے میں مقبول تھے۔ مزدور سے لے کر حکومت کے بڑے ایوانوں میں بیٹھنے والے لیڈران اور افسران انھیں چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں بہار کے دو گورنر صاحبان ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی اور جناب شفیع قریشی کے نام بطور خاص لیے جاتے ہیں۔ یہ حضرات رمز صاحب سے نہ صرف محبت کرتے تھے؛ بلکہ وقتاً فوقتاً مالی معاونت سے بھی نوازتے رہتے تھے۔

وہ 31/ مارچ 1991 عیسوی کو پی ڈبلیو ڈی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ معین صاحب کے مطابق:

> ''چوں کہ وہ اپنی ڈیوٹی میں سنجیدگی سے کوسوں دور رہے؛ اس لیے ریٹائرنمنٹ کے بعد پنشن حاصل کرنے میں انھیں بہت سی دشواریوں سے گزرنا پڑا۔ اس موقع سے اعجاز بن ضیا اوگانوی نے ان کی بہت مدد کی....''۔

(''مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا''، معین کوثر، ''رمز عظیم آبادی: شخصیت اور فن''ص:75-162)

رمز عظیم آبادی کے حالات زندگی کا غائر مطالعہ کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے لے کر اخیر تک ان کی زندگی جدوجہد، احتجاج اور تضادات میں گزری۔ وہ اپنی سوچ اور مزاج کے خلاف رتی بھر کوئی بات برداشت کرنے کے قائل نہ تھے۔ وہ اردو ادب کے مفلوک الحال؛ لیکن سچے عاشق تھے؛ مگر ساتھ ہی انھیں اردو داں طبقے، مقامی اخبارات و رسائل اور خود پسند لوگوں سے ہمیشہ شکایت رہتی تھی۔ سینئر صحافی اشرف استھانوی کے مطابق رمز صاحب اپنی ذاتی گفتگو میں اپنی ناقدری کی اکثر شکایت کیا کرتے تھے۔ وہ لسانی بھیت، تعصب، تنگ نظری، علاقائی شورش، علاحدگی پسندی اور ماحول کی کثافت کے لیے سیاست دانوں اور موجودہ نظام کو ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ان برائیوں اور لعنتوں کو دور کرنے کے لیے دانشوروں کو یکجا ہونے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ اس عظیم المرتبت شاعر کو موجودہ شاعری اور شاعروں سے بڑی شکایتیں تھی۔ وہ اس وقت کی شاعری کو آدھی ادھوری اور حقیقت سے پرے بتاتے ہیں۔

(ہفتہ وار ''سالارِ ہند''، پٹنہ، شمارہ نمبر:1، 29-23 جنوری 1995 عیسوی)

رمز عظیم آبادی جو کچھ تھے، وہ بالکل عیاں تھا۔ ان کے یہاں کوئی تصنع، ملمع اور بناوٹ کا گزر نہیں تھا۔ واحد نظیر کے مطابق ان کے یہاں قول و فعل میں تضاد نہ تھا، جب کہ عام طور سے شعرا کے متعلق یہ رائے ہے کہ ان کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے، خاص طور سے تخلیقات کے حزنیہ پہلو پر، مثلاً یہ کہ محلوں میں رہنے والا فنکار جھونپڑیوں کا کرب کیسے سمجھ سکتا ہے؛ لیکن رمز عظیم آبادی کا فن اس نہج سے سچا ثابت

ہوگا۔ واحد نظیر صاحب کے مطابق ان کو قریب سے جاننے والے جانتے ہیں کہ انھوں نے اپنے فن کو لہو دیا ہے، ان کی شاعری ان کی اپنی تصویر ہے اور ان جیسے انگنت پریشان حال انسانوں کی؛ لیکن رمز صاحب رموز حیات سے واقف تھے اور ہر حال میں خوش رہ کر زندگی جینے کا سلیقہ جانتے تھے۔

(''رمز عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، ناشر: سلسلہ پٹنہ ص:37-236)

رمز صاحب کو اہالیانِ ادب سے اکثر شکایت رہتی تھی کہ انھوں نے ان کی قدر نہ کی اور انھیں ایک الگ تھلگ نظریے سے دیکھتے رہے۔ اخبارات و رسائل نے انھیں قصداً نظر انداز کیا۔ اس بات کی تائید کرتے ہوئے رمز صاحب کے ساتھ اکثر شامیں گزارنے والے معروف شاعر اثر فریدی نے بھی لکھا ہے کہ:

> ''اردو ادب کی روایت کو برقرار رکھنے والا، علم کو بانٹنے والا، ایک کارواں ساتھ لے کر چلنے والا شاعر رمز عظیم آبادی خاموشی سے دنیا چھوڑ کر چلا گیا اور ادب کے ٹھیکیدار تماشہ دیکھتے رہے۔ بہت ہی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انھیں زندگی میں جو حق ملنا چاہیے تھا، وہ نہیں ملا....''۔

(''رمز عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، ص:237)

کسی زمانے میں ممبئی ہندوستان بھر کے معروف و غیر معروف ادیبوں کا مرکز ہوا کرتا تھی۔ وہاں بہت سے ادبا و شعرا فلموں میں اپنی قسمت آزماتے تھے۔ ان کی نیت میں شہرت اور دولت دونوں ہوتی تھی۔ بہت سے اس میں ناکام ہوتے تھے اور ممبئی سے مایوس ہو کر واپس اپنی جگہوں پر لوٹ جاتے تھے؛ لیکن انھیں میں سے کچھ ایسے قسمت والے بھی ہوتے تھے، جو کامیاب ہوتے تھے اور شہرت و دولت دونوں کما کر وہیں کے ہو جاتے تھے۔ ممبئی کے بعد شعرا و ادبا (خصوصاً بہار کے) نے کلکتہ کی طرف اپنا رخ کیا۔ اس وقت پٹنہ سے زیادہ کلکتے میں روزگار کے مواقع فراہم تھے، اس لیے بہار کے کئی نامور شعرا نے کلکتے کا سفر کیا اور وہاں رہ کر نہ صرف معاش کا مسئلہ حل کیا؛ بلکہ ادبی فتوحات بھی حاصل کیں۔ بہار سے وہاں جا کر تگ و دو کرنے والے شعرا کی فہرست لمبی ہے، نام لینے کی ضرورت نہیں۔ مقصد یہاں رمز عظیم آبادی کا ذکر کرنا ہے۔ رمز نے بھی معاشی تنگی سے گھبرا کر روشن مستقبل کی چاہ میں 1948 عیسوی میں کلکتے کا سفر کیا۔ وہاں ان کے معنوی استاذ اور نامور شاعر پرویز شاہدی پہلے سے موجود تھے۔ پرویز شاہدی سے ان کے بہت ہی گہرے روابط تھے۔ وہ بھی رمز صاحب کی صلاحیتوں کو پہچانتے تھے اور انھیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔ یہاں اس بات کا اعادہ غیر ضروری نہیں ہوگا کہ رمز پرویز شاہدی سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے کمیونزم کو ٹھیک سے نہیں سمجھنے کے باوجود کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی

رکنیت اختیار کر لی اور کچھ عرصے تک پرویز شاہدی کے ہم خیال اور ہم نظریہ ہو گئے۔ اس زمانے میں احسان دربھنگوی، اویس احمد دوراں، اشک امرتسری، سالک لکھنوی، ابراہیم ہوش، فاتح فاروق، عارف ہوشیار پوری، شمیم پھلواروی کے علاوہ بہت سے ترقی پسند شعرا کلکتے میں محفلیں روشن کیا کرتے تھے۔ اس وقت کے حالات بیان کرتے ہوئے سینئر ترقی پسند شاعر اویس احمد دوراں مرحوم نے لکھا ہے کہ:

''.... زکریا اسٹریٹ، مچھوا بازار، کولوٹولہ اسٹریٹ اور ویلزلی اسٹریٹ وغیرہ کے علاقے شعراء کلکتہ کے مسکن اور مامن تھے۔ شاعروں کی کہکشاں زیادہ تر زکریا اسٹریٹ میں جگمگاتی تھی، وہیں ہم لوگ اکٹھے ہوتے تھے۔ امجدیہ ہوٹل، امینیہ ہوٹل اور اشک امرتسری صاحب کی لانڈری میں بیٹھ کر ہم لوگ گھنٹوں باتیں کرتے تھے....''۔

(''رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، ص: 243)

ظاہر ہے کلکتہ ایک بڑا شہر رہا ہے اور وہاں ہر طرح کے مواقع مہیا رہے ہیں، وہاں ہم خیال اور ہم مزاج اشخاص کی بھی کمی نہیں تھی؛ لیکن رمز صاحب کو وہاں بھی جا کر ہاتھ رکشہ کھینچنا پڑا؛ یعنی کلکتہ میں برسوں رہنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو مطمئن اور آسودہ نہ کر سکے، لہٰذا تھک ہار کر وہ مستقلاً 1956ء میں پٹنہ واپس آ گئے اور پٹنہ میں ہر طرح کے مصائب اور مشکلات کو جھیلتے ہوئے آگے بڑھتے گئے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سماجی اور مالی حیثیت سے کم تر وہ انسان نہ صرف عظیم آباد؛ بلکہ پورے ہندوستان پر اپنی سچی اور اچھی شاعری کے سبب چھا گیا۔

رمزؔ عظیم آبادی کی حیات ایک کھلی کتاب ہے، کچھ ڈھکا چھپا نہیں ہے، سب کچھ عیاں اور واضح ہے۔ یہاں ان کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے یہ کوشش کی گئی کہ صرف ان کے نجی احوال سامنے آسکیں؛ کیوں کہ ان کی شاعری کے جائزے اور تجزیے کے لیے الگ سے باب مختص ہے۔

رمزؔ عظیم آبادی کی شاعری کا آغاز

رمضان کے قصیدے قوالیاں

رمزؔ عظیم آبادی کی شاعری کا آغاز رمضان کے قصیدے؛ یعنی رمضانی کلام سے ہوا، وہ 1947ء کا زمانہ تھا، اس وقت عظیم آباد سے رمضان کے مہینے میں سحری کے وقت روزہ داروں کو نیند سے بیدار کرنے کے لیے قافلے نکلا کرتے تھے۔ یوں تو پٹنہ سیٹی سے کئی قافلے نکلتے تھے؛ لیکن ان میں کشمیری کوٹھی سے نکلنے والے قافلے کی بہت دھوم تھی۔ اس قافلے کے شرکا رمزؔ عظیم آبادی کے کلام پڑھا کرتے تھے، اس قافلے کے سالار ایک صاحب محمد علیم تھے، محمد علیم کی آواز بہت مترنم تھی، وہ پڑھنے سے پہلے کلام کو ازبر کر لیا کرتے تھے۔ اس سے قبل رمز کا اپنا قافلۂ سحر محلہ گرہٹہ سے نکلتا تھا۔ اس قافلے کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی سربراہی خود رمز صاحب کیا کرتے تھے۔ روزے کے اختتام پر چاند کی رات کو بہت سے قافلے ایک ساتھ الوداعی کلام پڑھتے ہوئے مختلف علاقوں سے نکلتے تھے اور اکثر محلہ بٹاؤ کنواں، پٹنہ سیٹی میں یکجا ہوتے تھے، وہاں ایک انعامی مقابلہ برپا کیا جاتا تھا۔ ان دنوں رمز صاحب ہمیشہ قافلے میں شریک ہوتے تھے.... رمز صاحب کی شاعری کو جلا بخشنے میں ان کے رمضانی قصیدوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ان کے رمضانی کلام عوام وخواص میں اس لیے بھی بہت مقبول ہوئے کہ انھوں نے اپنے زمانے کی عام روش سے ہٹ کر کہا اور سننے والوں کو اس میں الگ طرح کی انفرادیت اور جاذبیت نظر آئی۔

آگے چل کر رمز کے مقابلے میں کئی ایسے شعرا بھی اس میدان میں آ گئے، جنھیں صحیح معنوں میں رمضان کے قصیدوں سے کوئی خاص شغف نہ تھا؛ لیکن چوں کہ یہ عوامی شہرت کا ایک بڑا ذریعہ بنتا جا رہا تھا؛ اس لیے وہ بھی اس میں شامل ہو گئے اور رمضانی قصیدے لکھ کر قافلہ سالاروں کو دینے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقابلہ آرائی کی نوبت آ گئی اور آپسی رسہ کشی کا بازار گرم ہو گیا۔ رمز صاحب تو نیک نیتی اور ثواب کی نیت سے اس میدان میں آئے تھے؛ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ گروپ بازی شروع ہو گئی ہے اور طرح طرح کے حربے اپنائے جا رہے ہیں تو وہ بددل ہو کر بہت حد تک اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس ضمن میں سید ناصر حسین زیدی کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں، اس میں قافلہ سحری کی روایت اور رمزؔ عظیم

آبادی کے تعلق سے اہم اطلاع فراہم کی گئی ہے۔

''رمضان مبارک میں سحر کے وقت روزہ داروں کو اٹھانے کا کام تقریباً ہر اس شہر اور گاؤں میں ہوتا ہے، جہاں مسلمان کی یکجا اچھی خاصی آبادی ہے، پٹنہ میں بھی سحر کو اٹھانے والوں کا تانتا بندھتا ہے؛ لیکن ایک خاص چیز اضافی طور پر یہاں دیکھنے میں آئی کہ سحر کے وقت باقاعدہ ایک تربیت یافتہ قافلہ نظم پڑھتا ہوا محلّہ میں گشت کرتا ہے۔ اس طرح ہر محلّہ کا الگ الگ قافلہ ہوتا ہے۔ یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں، جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا، وہ یہ ہے کہ آزادیِ ہند کے بعد ہی قافلہ سحری کا سلسلہ شروع ہوا اور قدیم ضلع پٹنہ میں ہی اس کا رواج ہے۔ یہ قافلے اپنا اپنا شاعر متعین کئے رہتے ہیں، جن سے ہر سال رمضان کے لیے ایک دو نظمیں مل جاتی ہیں اور شاعروں کا بھی کچھ بھلا ہو جاتا ہے۔ رمزؔ اس سلسلہ میں ایک انجمن تھے؛ اس لیے کہ ان کے شاگردوں کا بہت وسیع حلقہ تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صرف قافلہ سحری کے لیے نعت گو شاعر نہ تھے؛ بلکہ وہ اعلیٰ ترین نظم نگار اور غزل گو بھی تھے، جہاں تک مجھے علم ہے ان کے شاگردوں میں اخترؔ عظیم آبادی، کیفؔ عظیم آبادی، احمد تبسم اور ان کے علاوہ بھی بہت سے شاگرد تھے، ان تینوں کو تو میں نے ہمیشہ استاد کہتے سنا''۔

ناصر حسین زیدی مرحوم نے رمزؔ صاحب کی کنارہ کشی اور بدظنی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''قافلوں میں دلچسپی کا یہ سلسلہ چند برسوں تک چلا؛ مگر اس کی شہرت نیک نامی اور کامیابیوں کو دیکھ کر موقع پرستوں کے منہ میں پانی آ گیا اور اس کے بعد نتیجہ ظاہر تھا، جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، جم کر گروپ بازی اور فتنہ گری شروع ہوگئی۔ رمز صاحب سیدھے سادے اور بے غرض انسان تھے، وہ قافلۂ سحر میں کلام لکھنے اور اس میں شریک ہونے کو ثواب کا ذریعہ سمجھتے تھے؛ لیکن انھوں نے دیکھا کہ ان کے اکثر ہم عصر اسے شہرت کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے کچھ بھی کرنے پر آمادہ ہیں تو انھوں نے اس سے علاحدگی اختیار کرلی''۔

(''رمزؔ عظیم آبادی: شخصیات اور فن''، ص: 70-69)

رمزؔ صاحب کے زمانے میں عظیم آباد میں قصیدہ پارٹیوں کا بہت زور و شور تھا، بطور خاص پٹنہ سیٹی کے مختلف محلوں سے رمضان کے قصیدے پڑھتے ہوئے بوقت سحر بہت سے قافلے نکلتے تھے؛ تاکہ روزے داران کے کلام سن کر بیدار ہوا جائیں۔ معروف مترنم شاعر احمد تبسم رمزؔ صاحب کے بڑے مداح تھے، وہ رمز صاحب کو فطری شاعر کہتے تھے، ان کے مطابق رمز کے یہاں شعروں کی

بارش ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں اس وقت کے پٹنہ میں قافلۂ سحر کے احوال بتاتے ہوئے رمزؔ عظیم آبادی کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق:

''پٹنہ سیٹی کے گرہٹہ محلّہ سے رمضان المبارک کے موقع پر قصیدہ پارٹی نکلتی تھی، ضمیر صاحب ایک شخص تھے، ان کو قصیدہ پڑھنے کا شوق تھا اور انہی کی رہنمائی میں یہ پارٹی نکلتی تھی، ضمیر صاحب بیڑی بناتے تھے اور پڑھے لکھے نہیں تھے۔ رمز صاحب نے ان کو قصیدہ لکھ لکھ کر دینا شروع کیا۔ اسی زمانے میں صدر گلی سے میری رہنمائی میں بھی ایک قافلۂ سحری نکلنے لگا۔ اسی دوران ہم سے رمزؔ کی چشمک ہوگئی اور اس نے خود اپنی آزاد پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا۔ کشمیری کوٹھی میں قافلہ کا قیام ہوا اور رمزؔ کی رہنمائی میں میرے قافلے کے متوازی اس کا قافلہ بھی نکلنے لگا۔ وہ خود کلام لکھتا تھا اور پڑھواتا تھا، چوں کہ اس کی آواز میں ترنم نہ تھا؛ اس لیے اچھی آواز والوں سے اپنا کلام پڑھواتا تھا۔ قصیدہ خوانی کے جلسے مختلف محلوں میں ہوتے تھے، جیسے معروف گنج، طیب راج کی مسجد میں، جھاؤ گنج کی مسجد میں۔

مختلف قافلہ سحری میں جم کر مقابلہ ہوتا تھا، کبھی کبھار مار پیٹ کی نوبت آجاتی تھی۔ عوام میری خوش گلوئی کے معترف تھے اور اکثر ان کی حمایت میرے ساتھ ہوتی تھی۔ رمزؔ کو علی الاعلان کہتے ہوئے سنا جاتا تھا کہ ''اچھی آواز سننا ہو تو تبسم کو سنو۔ کلام سننا ہو تو میرے پاس آؤ''۔ بعد میں حمیدؔ عظیم آبادی نے میرے کلام کو کچھ اور سنوار دیا تو ہم یہ کہنے لگے کہ میرے پاس ترنم بھی ہے، کلام بھی ہے۔ رمزؔ تو یونہی ہے؛ مگر یہ کہنے کی بات تھی، سچی بات یہ ہے کہ وہ فطری شاعر تھا''۔

اس انٹرویو میں احمد تبسم نے پٹنہ میں قصیدہ کے ادوار کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:

''قصیدہ کا دور غالباً 1948ء سے 1952ء کے درمیان رہا۔ انہی دنوں رمزؔ نے کیفؔ عظیم آبادی کو اپنے قریب کیا؛ کیوں کہ وہ بہت دل کش آواز کے مالک تھے۔ قصیدے کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ایک بار پٹنہ سیٹی میں یہ مقابلہ ہوا، جس کے جج انیس الرحمٰن (مدیر ''مصور''، پٹنہ 57-1955ء) صاحب تھے۔ انھوں نے اس مقابلہ میں رمزؔ کو فرسٹ پرائز اور مجھ کو سیکنڈ پرائز کا مستحق قرار دیا۔ اس پر میرا اصرار ہوا کہ مجھے فرسٹ پرائز ملنا چاہیے اور جج صاحب کو بلایا جائے؛ لیکن وہ آئے نہیں۔ میرے احتجاج پر رمزؔ نے کہا کہ چھوڑو یہ تکرار، میں تم کو فرسٹ مان لیتا ہوں اور میں سیکنڈ ہو جاتا ہوں....''۔

(''رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، ص: 106-09)

اور اس طرح دونوں ہم عصر شعرا کے بیچ کا معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ اس اقتباس میں احمد تبسم نے بظاہر اپنا واقعہ بیان کیا ہے؛ لیکن اس سے رمز صاحب کی کشادہ قلبی اور صلح پسندی کھل کر سامنے آتی ہے۔ وہ کبھی کبھی ظرف کے معاملے میں بڑے بڑے اعلیٰ ظرفوں سے بھی آگے نکل جاتے تھے۔ ان کو قدرت نے ایک خالص فنکار بنایا تھا اور خالص فنکار فروعی اور معمولی باتوں میں نہیں الجھتا۔ وہ ہمیشہ آگے کی راہ دیکھتا ہے اور بالآخر ایک دن اس منزل پر پہنچ جاتا ہے، جہاں سے اس کے بیشتر ہم عصروں کے چہرے دھندلے دکھائی دیتے ہیں۔

رمز کو ان کے وقت نے حقیر اور کم تر سمجھا؛ کیوں کہ وہ بہت پڑھے لکھے اور باثروت آدمی نہیں تھے۔ ان کے عہد میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ عوام کا بڑا طبقہ انھیں دل و جان سے پسند کرتا تھا، جب کہ شاعروں کا طبقہ اور خاص طور پر اس وقت کے اساتذہ ناپسند کرتے تھے اور انھیں بے علم اور ان پڑھ گردانتے تھے۔ مثال کے طور پر رمز نے ابتدا میں اپنے کلام کی اصلاح کے لیے اپنے وقت کے استاد شاعر حمیدؔ عظیم آبادی سے رجوع کیا؛ لیکن انھوں نے رمز کو کم علم اور جاہل سمجھتے ہوئے انھیں اصلاح دینے سے منع کر دیا، اس کے بعد وہ ثاقبؔ عظیم آبادی کے قریب گئے۔ ثاقبؔ عظیم آبادی نے کچھ دنوں تک اصلاح دی اور پھر یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اس کے بعد زارؔ عظیم آبادی ان کے استاد ہوئے۔ رمز نے زار صاحب سے عروض کی باریکیاں سیکھیں اور یہ سلسلہ تادیر جاری رہا۔

درج بالا سطور میں رمضان کی قصیدہ گوئی کا ذکر ہوا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ رمز صاحب صرف ثواب اور نیک نیتی کی غرض سے رمضان میں قصیدے لکھ کر قافلہ سالاروں کو دیا کرتے تھے، نیز یہ کہ وہ اس معاملے میں اکثر کشادہ قلب اور بے غرض تھے، جب کہ متین عمادی نے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے ان کی کمزوریوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''.... میں قصیدہ گوئی کی دنیا سے بہت دور تھا۔ اس طرف توجہ بھی نہیں تھی۔

ایک دن میرے گہرے دوست شکیب ایاز نے مجھے کہا کہ متین صاحب محلّہ لودی کٹرہ سے جمن خلیفہ کا قافلہ سحر نکلتا ہے۔ اس کے شاعر وہ اور ان کے بھائی اختر عظیم آبادی ہیں۔ اس قافلہ کا شاعر بستہ باچو ہے، جو غیر قوم کا ہے اور بہت عمدہ پڑھتا ہے، آپ بھی کوئی قصیدہ لکھ کر دیجیے۔ رمضان کی 20 یا 22 تاریخ ہو چکی تھی۔ جمن خلیفہ نے فرمائش کی کہ فلمی گانا ''ہائے رے انسان کی مجبوریاں'' پر الوداع لکھ دیجیے۔ میں نے پہلی بار الوداع لکھا۔ جس کا مطلع تھا ؎

ماہ رحمت جا رہا ہے تو کہاں
ذہن پر گرتی ہیں غم کی بجلیاں

یہ الوداع محلّہ چھڑ دریہ میں قافلہ کے اجتماع میں پڑھا گیا۔

قصیدہ نے اچھے تاثرات دکھائے، بعض سامعین کی آنکھیں بھیگ گئیں، اس کے بعد سے میں جمن خلیفہ کے قافلہ سحر کا مستقل شاعر بن گیا۔ چند سال کے بعد یہ قافلہ سحر ٹوٹ گیا اور عرصہ تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد رشید عارف نے چند نوجوانوں کو سمیٹ کر ایک نئے قافلۂ سحر کی بنیاد ڈالی۔ وہ اور میں اس قافلۂ سحر کا شاعر رہا..... شاعر کی حیثیت سے قافلۂ سحر میں شرکت رمزؔ عظیم آبادی کو کھل گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ 90 فی صد قافلۂ سحر رمزؔ کے کلام پڑھتے تھے۔ 10 فی صد ایسے قافلے تھے جو دوسرے شاعروں کا کلام پڑھتے تھے۔ جن جن قافلوں کو رمزؔ کلام دیتے تھے۔ وہ ان کی مالی امداد کرتے تھے۔ ایک قافلہ کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ عید میں رمزؔ کا کپڑا بنا دیا کرتا تھا۔ شاید میری شرکت سے رمزؔ کو یہ گمان ہو گیا کہ متین صاحب کے آجانے سے کچھ قافلے ان کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور ان کی یافت میں کمی آجائے گی۔ نتیجتاً وہ میرے کلام میں نقص نکالنے لگے اور میری مخالفت میں زبان کھولنے لگے۔ ایک بار جب ایک قافلے نے میرا کلام پڑھا تو رمز نے اس پر اعتراض ہی نہیں کیا؛ بلکہ یہ کہا کہ قافلہ اپنے شاعر کو یہ بتا دے کہ اس کے یہاں کیا عیب ہے، جب یہ بات میرے کان تک پہنچی تو مجھے ان کی طینت پر دکھ ہوا۔ اگر میرے کلام میں عیب تھا تو وہ بلاواسطہ مجھ سے کہہ سکتے تھے۔ اس طرح مجمع میں قافلہ سحر کو مخاطب کر کے مجھے ذلیل کرنا موزوں نہیں تھا''۔

(''رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، ص: 135-134)

خیر ہم عصر شعرا کے درمیان ایسی چشمکیں ہوتی رہی ہیں۔ اس کی بہتیرے مثالیں اردو ادب کی تاریخ میں مل جاتی ہیں، باہمی حسد اور رقابت کے سبب اساتذہ کے زمانے میں اکثر نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی تھی۔ رمز صاحب کے یہاں اگر اس طرح کے کمزور پہلو ہیں تو دوسری طرف فراخ دلی اور کشادہ قلبی کی بھی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال اوپر کی سطروں میں احمد تبسم مرحوم والی ہے۔

رمز صاحب انسان تھے؛ اس لیے ان کے یہاں بشری خامیاں بھی تھیں۔ وہ ادب کے ذریعے اپنی کچھ معاشی مشکلات کو دور کرنا چاہتے تھے تو اس میں معیوب بات کچھ نہیں تھی۔ وہ پیدائشی مزدور تھے۔ انھوں نے جہاں جسمانی محنت سے پیسے کمانے کی کوشش کی تو آگے چل کر قلم کے مزدور بھی ہوئے اور اس کے ذریعے بھی پیسے حاصل کرنے کا راستہ نکالا، اس کی بڑی مثال قوالوں کے لیے کلام لکھنا تھا۔ ملاحظہ کریں نمونے کے طور پر کچھ کلام:

ترانہ ہائے سحر معروف بہ رمضان کے قصیدے

(۱)

اے ماہِ مکرم نہ مرے دل کو جلاؤ
ہاتھوں سے مرے دامنِ رحمت نہ چھڑاؤ
احساسِ خزاں ہی سے عجب رنگ ہوا ہے
پھولوں کی قبا چاک ہے بے تاب صبا ہے
منظر ہے غنیمت پسِ منظر نہ دکھاؤ
پیاسے جو رہے رند تو اے ماہِ منور
آنکھوں سے ستاروں کی چھلک جائے گا کوثر
اے ساقیٔ کونین ابھی پیاس بجھاؤ....
کہتے ہیں سبھی لوگ کہ ہے وقت مسیحا
سنتے ہیں کہ کردیتا ہے ہر زخم کو اچھا
کیا ہجر مہہِ صوم کا بھردے گا یہ گھاؤ
معلوم ہے دنیا کو یہی عہد کئے ہیں
یہ رمزؔ رہِ شوق میں مٹنے کے لئے ہے
تم شمعِ کرم ہو اِسے پروانہ بناؤ

(۲)

یوں مہہِ پاک تیرے دیوانے جانتے ہیں مآل ہنسنے کا
خار بن کر دلوں میں چبھتا ہے عید میں بھی خیال ہنسنے کا
ظلمت اتنی ہی تیز تر ہوگی جس قدر روشنی زیادہ ہے

خاک اڑنے لگی ہیں گلشن میں ختم ہوتا ہے گل کا افسانہ
روزہ دار و وِداعِ ماہِ عطا حادثہ ہے یہ جانا پہچانا

کوئی موضوعِ گفتگو ہی نہیں جو سخن ہے وہ بے ارادہ ہے

جو ستم بھی زمانہ ساز کریں خندہ پیشانی سے یہ سہتا ہے
یہ کسی کو حریف کیا سمجھے یہ تو دشمن کو دوست کہتا ہے
یہ نہ دزدِ سخن، نہ حاسد ہے رمزؔ تو اک فقیر زادہ ہے

(۳)

آنکھوں سے انقلابِ چمن دیکھنا پڑا
جلتے ہوئے گلوں کا بدن دیکھنا پڑا
شیشے چنے گئے ہیں سلیقے سے ہرطرف
یہ کون اٹھ گیا میری بزمِ نشاط سے
پیاسا کھڑا ہوں دور تہِ جام تک نہیں
پینا پڑے گا اشک مگر احتیاط سے
یہ بھی ہے میکشی کا چلن دیکھنا پڑا....
آئے گا چین کیسے دلِ بیقرار کو
یہ بات پوچھنا تو مہہ دیں گلہ نہیں
رحمت خدا کی روٹھ گئی ہے زمین سے
دنیا میں رنگ و نور کا وہ سلسلہ نہیں
ویران ہوتے شامِ دلہن دیکھنا پڑا....
ہوتی رہیں کلام پہ جو نکتہ چینیاں
یہ دشمنی نہیں اسے احساں بتایئے
اے رمزؔ یہ بھی ثاقبؔ و پرویزؔ کا ہے فیض
شعروں میں کس طرح سے نئی بات لایئے
یاروں کی میرا رنگِ سخن دیکھنا پڑا....

❁

مہہ دیں تھے آشنا ہم غمِ تیرگی سے پہلے
یہ خلش نہیں تھی دل میں تری روشنی سے پہلے
وہ قرأت وہ سجدہ ریزی وہ سحر کی دلنوازی
مہِ صوم کیوں نہ روئیں ترے واسطے نمازی
یہ تڑپ نہ تھی جبیں میں شبِ بندگی سے پہلے....
ہے قصیدہ گوئی بھی فن ، یہ خیال اب ہے سب کا
مجھے رمزؔ یہ یقیں ہے کیا پورا حق ادب کا
نہ لطافتِ سخن تھی مری شاعری سے پہلے ....

❁

(۴)

آسماں پر ماہ دیں کا نور ہے پھیلا ہوا
کون بد قسمت ہے جو بستر پہ ہے سویا ہوا
تشنہ کامو آؤ پھر کرلو نظارہ جام کا
وہ ہلالِ ماہ انور ہے کنارہ جام کا
ساقیٔ بزمِ حرم ہے بزم میں آیا ہوا
- - - - - کون بدقسمت
لیکے آیا ہے مہہِ دیں تحفۂ اُم الکتاب
آرہی ہے پھر صدائے انقلاب و انقلاب
تیری غربت آج بھی سوئی ہے تجھ کو کیا ہوا
- - - - - کون بدقسمت

(۵)

یقیں ہے یہ تیری فرقت میں رونے والوں کا
رکا رہے گا یوں ہی قافلہ اجالوں کا
مہِ صیام کی رخصت کا درد سہہ جائیں
کوئی بتائے کہ خاموش کیسے رہ جائیں
ابھی تو زخم ہرا ہے گزشتہ سالوں کا یقیں ہے
رہیں گے ساتھ میرے رنگ و نور کے جلوے
نہیں ہیں رمزؔ یہ دامن پہ اشک کے قطرے
مہِ صیام نے تحفہ دیا اجالوں کا یقیں ہے

(۶)

دیوانے تیرے غم میں اے ماہِ عطا ہوں گے
ہم اہلِ حرم سے اب سجدے نہ ادا ہوں گے
جب اوس کی بوندوں پر شک ہوگا ستاروں کا
جب قافلہ ٹھہرے گا، گلشن میں بہاروں کا
ہم جانے کہاں اس دن اے بادِ صبا ہوں گے دیوانے تیرے
جو کچھ بھی گزر جائے ہجرِ مہہ انور میں
دل عید کے دن ڈوبے اشکوں کے سمندر میں
جو حال بھی ہو لیکن مصروف دعا ہوں گے دیوانے تیرے
احساسِ الم کھو کر سراپنا جھکائیں گے
اے رمزؔ وہ خود اپنی تاریخ بنائیں گے
جو لوگ کہ دنیا میں پابند وفا ہوں گے دیوانے تیرے

❁

مندرجہ بالا رمضانی کلام کے یہ حصے ''رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن'' کے مرتب محمد شمس الحق کے یکجا کیے ہوئے ہیں۔ راقم الحروف نے طوالت کے خوف سے صرف کچھ حصوں کو یہاں نقل کیا

ہے۔مقصد یہ ہے کہ ان قصیدوں سے رمزؔ کا رنگِ سخن معلوم ہو اور پتہ چلے کہ اس میدان میں بھی وہ اپنے معاصر شعرا سے کس طور پر الگ اور منفرد تھے۔

نقل کئے گئے کلام کے حصوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رمزؔ نے اپنے عہد میں مروجہ ڈگر سے ہٹ کر قصیدے کہنے کی کوشش کی ہے، جیسے

اے ماہِ مکرم نہ مرے دل کو جلاؤ

والے قصیدے، یا ترانے کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف لفظیات کی سطح پر؛ بلکہ خیالات کی سطح پر بھی یہاں ندرت ہے۔ ماہِ مکرم کی رخصت کو شاید ہی کوئی شاعر ''دل جلانے'' کے مترادف لکھے؛ لیکن یہاں رمزؔ نے اس کیفیت کو زبان دی ہے، جو واقعی ان پر طاری تھی۔ اس قصیدے میں آگے چل کر رمضان کی رخصت کے بعد کے سماں کو خزاں سے تعبیر کیا ہے، جب کہ رمضان کے بعد کا مہینہ بھی اہم اور برکت والا ہوتا ہے؛ اس لیے اسے خزاں سے تعبیر کرنا بظاہر مناسب نہیں؛ لیکن شاعر نے یہاں قصداً اس لفظ کا استعمال کر کے ایک تقابلی صورت حال کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں مقصد صرف رمضان کی عظمت وحرمت کو اجاگر کرنا ہے۔ اس قصیدے میں آگے چل کر شاعر نے کہا ہے کہ سنتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہر زخم بھر جاتا ہے؛ لیکن کیا ماہِ صیام کی رخصت کا زخم وقت بھر سکے گا؟ بادی النظر میں یہ ایک سیدھا سادہ سوال ہے؛ لیکن اس میں عقیدت اور محبت کی وہ شدت ہے، جو تا دیر قائم رہتی ہے۔

دوسرے قصیدے کے بندوں کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ یہاں شاعر نے بالکل جداگانہ انداز واسلوب اپنایا ہے اور جذبے کی شدت اپنے عروج پر ہے۔ شاعر کو ماہِ رمضان سے اس قدر عقیدت ومحبت ہے کہ اسے عید کی خوشیاں ہیچ لگتی ہیں اور رمضان کے بعد کے دن کو وہ ظلمت بھرا بتاتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ وہ عید کے بعد کی رمق دمک کو خواہ وہ جس قدر بڑھ جائیں، اس کو تاریکی سے ہی تعبیر کرتا ہے۔ یہی نہیں آگے چل کر وہ رمضان کی رخصت کو ایک حادثہ بھی قرار دیتا ہے۔ رمزؔ کا یہ اپنا انداز اور اپنا خیال ہے، اس سے تعرض اور اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے؛ لیکن جب بندہ پر جوشِ عقیدت غالب آتا ہے تو اس طرح کی چھوٹی موٹی غلطیاں سرزد ہو ہی جاتی ہیں۔

رمزؔ کے یہاں اکثر قصیدوں میں خاکساری اور انکساری کی بھی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً اسی

قصیدے کے آخری بند میں وہ کہتے ہیں کہ خواہ دنیا ان پر لاکھ جور وستم کرے؛ مگر وہ سب کو اپنا دوست سمجھتے ہیں اور کسی سے کوئی پرخاش نہیں رکھتے۔ اس بند کا آخری مصرعہ کمال کا ہے۔ یہاں شاعر خود کو فقیر زادہ کہتا ہے اور اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ نہ حاسد ہے، نہ غاصب ہے اور نہ کسی کا کلام اپنے نام سے پڑھتا ہے۔ یہاں ''دردِ سخن'' کی ترکیب ان حاسدین کو جواب ہے، جو رمزؔ پر مانگے کا کلام پڑھنے کا الزام عائد کرتے تھے۔

رمزؔ کے تیسرے قصیدے میں قدرے احتیاط اور اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی مثال کے طور پر شاعر کے مصرعے ''پینا پڑے گا اشک مگر احتیاط سے'' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہاں بھی کیفیت وہی ہے؛ مگر لفظیاتی سطح پر حد درجہ اعتدال کو برتا گیا ہے۔

اس قصیدے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اخیر میں شاعر نے خود اپنی زبان سے اپنی ندرت اور انفرادیت کا اظہار کیا ہے۔ وہ اپنے حاسدین اور معاصر شعرا کو ہدف بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے کلام پر تنقید اور نکتہ چینی ان کے لیے ایک طرح سے احسان ہے اور پھر وہ آگے کے تین مصرعوں میں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے اساتذہ ثاقبؔ عظیم آبادی اور پرویزؔ شاہدی کا فیض ہے کہ ان کے یہاں کلام میں ندرت اور انفرادیت ہے اور انہیں خوبیوں کو دیکھ کر ان کے یار یعنی ان کے معاصرین ان سے بغض وعناد کا رویہ روا رکھتے ہیں۔ رمز صاحب اپنے قصیدوں کے ذریعے بھی اپنے مخالفین کو جواب دینے سے باز نہیں آتے۔ یہ خالصتاً ان کے مزاج اور موڈ کا معاملہ ہے۔

رمزؔ نے اپنے چوتھے قصیدے میں ماہِ صیام کی رخصت پر غم واندوہ کا اظہار کرتے ہوئے ایک بہت ہی اہم نکتے کو اجاگر کیا ہے۔ اس جانب بہت سے نقادوں اور ان کے معاصرین نے بھی اشارہ کیا ہے۔ رمزؔ کے مطابق قصیدہ گوئی (رمضانی کلام) بھی ایک اہم فن ہے اور خدا کے فضل سے انھوں نے اس فن کا حق ادا کیا ہے۔ نیز یہ کہ ان کے یہاں لطافت سخن اسی کی بدولت ہے۔ ان کا یہ دعویٰ ہوسکتا ہے، خودستائی پر مبنی قرار دیا جائے؛ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ رمزؔ کی شاعری کا اصل آغاز انہیں قصیدوں سے ہوا اور آگے چل کر یہی طبع آزمائی ان کے کام آئی۔

پانچویں قصیدے میں شاعر نے ان مومنین کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے، جو خواب غفلت میں پڑے ہیں اور ہر طرح کی برکتوں سے محروم ہو کر غربت کے محبس میں پڑے ہوئے ہیں۔ چھٹے قصیدے میں بھی شاعر نے معتدل انداز اپناتے ہوئے کہا ہے کہ گرچہ عید کے دن بھی ہم اشکوں

کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں، پھر بھی ہم دعا گو ہیں خواہ تیری جدائی جس قدر تیز ہو۔ اس قصیدے کے آخری دو مصرعے گرچہ رمضانی قصیدے کے ہیں؛ لیکن ان میں غزلیہ رنگ کو صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے ؎

اے رمزؔ وہ خود اپنی تاریخ بنائیں گے
جو لوگ کہ دنیا میں پابند وفا ہوں گے

درج بالا سطور میں صرف چند قصیدوں کے کچھ حصوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں زیادہ تنقیدی اور تجزیاتی انداز نہ اپناتے ہوئے براہ راست شاعر کی ان خصوصیات کی طرف اشارے کئے گئے ہیں، جو انھیں دوسروں سے ممتاز اور منفرد کرتے ہیں۔

رمزؔ کی شاعری کو جلا بخشنے میں ان کی قوالیوں کا بھی بڑا کردار رہا ہے۔ اس میدان میں ان کے استاد منظرؔ عظیم آبادی تھے۔ رمزؔ نے ان سے قوالی لکھنے کا فن سیکھا اور مختلف قوالوں کو ان کی ضرورت اور سامعین کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے کلام لکھنے لگے۔ قوالی کے لیے کلام لکھنا ان کی مجبوری تھی، اس سے جو آمدنی ہوتی تھی، وہ ان کے لیے ایک سہارا تھی، وہ اس آمدنی سے اپنے خستہ حال استاد کو بھی مستفید کرتے تھے؛ لیکن قوالی لکھنے کے ساتھ ساتھ محنت مزدوری اور رکشہ پلنگ بھی جاری تھی۔ ادھر عظیم آباد اور بہار میں قوالی کا اتنا چلن بھی نہیں تھا۔ ان دنوں کلکتہ میں قوالوں اور قوالی کی دھوم تھی؛ اسی لیے رمزنے پٹنہ کو خیر آباد کیا اور 1948ء میں کلکتہ روانہ ہوگئے، چوں کہ وہ زود گو تھے اور بقول احمد تبسم ان کے یہاں اشعار کی بارش ہوتی تھی؛ اس لیے یہ خوبی کلکتہ میں بہت بارآور ثابت ہوئی۔ وہاں رمزؔ کا سکّہ جم گیا۔ وہ معروف، غیر معروف تمام قوالوں کے لیے قوالیاں لکھنے لگے۔ اس طرح پٹنہ کے مقابلے میں ان کی آمدنی اچھی خاصی بڑھ گئی۔ اس وقت کلکتہ کے قوالوں میں یوسف آزاد، پنالال بوس، رستم قوال، حافظ نابینا، ثریا پروین، امیرا کبر اور طلعت بانو جیسے قوالوں اور قوالہ کی بہت دھوم تھی۔ رمزؔ نے ان کو کلام لکھ لکھ کر دیا اور نہ صرف پیسے حاصل کئے؛ بلکہ شہرت بھی پائی۔

قوالی سے گرچہ ان کو بہت کچھ نہیں مل سکا؛ مگر ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلسل مشق سے ان کی شاعری میں روانی آئی، نکھار آیا۔

دوسری بات یہ کہ رمزؔ نے اس میدان کے کلام میں بھی اپنی خاص شناخت اور معیار کو حتی الامکان قائم رکھا، ورنہ اکثر قوالی کے کلام میں سوقیانہ پن اور فحاشی کا رواج عام رہا ہے۔ دوسری

بات یہ کہ رمزؔ نے قوالی کے لیے لکھے گئے کلام میں تلخیِ حیات اور بے ثباتیِ علم کو بدرجہ اتم پیش کیا، جو عام طور پر دیکھنے کو نہیں ملتا۔ رمزؔ نے قوالی کی محفل کے مزاج کو دیکھتے ہوئے بہتیرے عاشقانہ کلام بھی کہے؛ لیکن یہاں بھی اپنی سطح سے گرے نہیں اور جو کچھ کہا، حقیقت سے قریب ہوکر کہا۔ ملاحظہ کریں یہاں صرف ایک شعر ؎

ترے لبوں سے چرائی تھی جو مئے عشرت
سرور اسی کا مصیبت میں کام آیا

کلکتہ سے واپسی کے بعد پٹنہ میں رمزؔ نے مستقلاً اپنا پیر جمالیا اور یہاں کے قوالوں کو پھر اپنا کلام لکھ کر دینے لگے۔ پٹنہ کے قوال میں ان دنوں پنڈت سیوبا لک، فاروق داناپوری، محمد بشیر، شمیم احمد، محمد رفیع اور شمیم شعلہ جیسے قوال اور قوالہ کی خوب چلتی تھی۔ رمزؔ صاحب اب اس میدان میں پوری طرح ماہر ہوگئے تھے۔ ان کے کلام جب یہ قوال اور قوالہ پڑھتے تو سامعین جھوم اٹھتے تھے۔ ان دنوں کا رواج یہ تھا کہ قوال حضرات رمزؔ صاحب کے پاس کسی مقبول فلمی گانے کی دھن لے کر آتے تھے اور اس پر کلام لکھنے کی فرمائش کرتے تھے۔ دوسرے شعرا قوالی کے کلام خواہ جس طرح لکھتے ہوں رمزؔ صاحب اس قبیل کے کلام لکھتے وقت بھی سنجیدگی اختیار کرتے تھے اور اپنی شہادت کی انگلی کو فضا میں گھما گھما کر اشعار تخلیق کرتے تھے۔ اس طرح کا ایک واقعہ رشید عارف نے بیان کرتے ہوئے اپنے مضمون ''وہ جو اپنا بھی تھا پرایا بھی'' میں لکھا ہے کہ:

''جناب فاروق قوال کی فرمائش پر قوالی کا شعر کہہ رہے ہیں، فضا میں انگشت شہادت لہرائی اور مجھ سے کہا: ''لکھو''۔ یہ سلسلہ 15-10 منٹ تک چلا۔ قوالی تیار۔ فاروق قوال شاداں و فرہاں مبلغ دس روپے نذرانہ پیش کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اس طرح قوال اور قوالہ کا سلسلہ جاری رہتا۔ جناب رمزؔ اپنے قوال کے ساتھ اسٹیج پر خود بھی بیٹھا کرتے تھے۔ قوالوں میں چوں کہ مقابلہ چلا کرتا ہے اس لیے فی البدیہہ شعر کہہ کر اپنے قوال کو دیا کرتے تھے۔ میرے ماموں کی شادی میں قوالی گانے کے لیے دو پارٹیاں آئی تھیں، ان میں ایک پارٹی میں جناب رمزؔ صاحب نہ صرف شریک تھے بلکہ اپنے قوال کے ساتھ بذات خود گا بھی رہے تھے''۔

(''رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، ص: 135-134)

گویا رمزؔ کہیں بھی پردے کے پیچھے رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ جو کچھ کرتے تھے، اس میں ان کو کوئی عار نہیں تھا۔ صوبہ بہار میں ایسا البیلا شاعر شاید ہی کہیں ملے۔ وہ چوں کہ عوام کے درمیان رہنے والے انسان تھے؛ اس لیے ہر طرح کی سرگرمی میں وہ نمایاں رہنا چاہتے تھے۔ اپنے قوال کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھنا اور اس کی آواز میں آواز ملانا بہت ہی انوکھا اور چشم کشا واقعہ ہے اور اس طرح کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔ رمزؔ نے قوالوں کے لیے، جس طرح کے کلام لکھے، وہ بھی اپنے آپ میں مثال ہیں۔ وہاں بھی انھوں نے اپنا انداز اور معیار وہی رکھا جو کہ پہلے سے تھا۔ وہ معیار کے معاملے میں ذرا بھی نہیں جھکے۔ آج رمزؔ کے قوالی والے کلام موجود ہیں، انھیں دیکھ کر اس بات کی تصدیق کی جاسکتی ہے؛ اس لیے اگر آج کوئی محقق یا ادیب رمزؔ کی شاعرانہ خصوصیات پر مقالہ لکھنا چاہے تو اسے چاہیے، وہ رمزؔ کے قصائد اور ان کی قوالیوں کا بھی مطالعہ کرلے، تب ہی جا کر رمزؔ کی شاعری کا صحیح صحیح احاطہ ہو پائے گا۔ اس ضمن میں سہیل اختر نے اپنے ایک مضمون ''رمزؔ عظیم آبادی کی ایک اور دنیا'' میں بہت ہی تفصیل کے ساتھ قوالی کی روایت اور فن کے ضمن میں رمزؔ کی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے گھرانے اور اپنے والد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے والد صاحب کوئی خاندانی قوال نہیں تھے؛ مگر قوالی گانا ان کا ایک مشغلہ تھا اور وہ قوالی کی محفلوں میں قوالی گایا کرتے تھے۔ وہ رمزؔ صاحب کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''جب سے ہم نے ہوش سنبھالا، والد صاحب کو زیادہ تر رمزؔ عظیم آبادی کا ہی کلام گاتے ہوئے پایا۔ قوالی کے شوقین ہندوستان میں صرف مسلمان ہی نہیں؛ بلکہ دوسرے مذاہب کے ماننے والے لوگ بھی ہیں۔ صرف خانقاہوں، یا مزاروں پر نہیں؛ بلکہ درگا پوجا، لکشمی پوجا، سرسوتی پوجا جیسے تیوہار اور شادی بیاہ کے موقع پر اکثر قوال کا پروگرام ہوا کرتا ہے اور اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں ہندوستان کے گوشے گوشے کے قوال مصروف رہا کرتے ہیں۔ گویا قوالی صرف خانقاہوں، مزاروں پر ہی نہیں؛ بلکہ عوام کے بیچ بھی ہوا کرتی ہے.....
>
> بہار کی راجدھانی پٹنہ میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد بہت سے قوال تھے؛ مگر عوام کے بیچ دو ہی قوال شہرت کی بلندی پر پہنچے۔ ایک پٹنہ سیٹی کے شیو بالک قوال اور دوسرے کھگول کے محمد فاروق قوال۔ عظیم آباد کا ہر اہل علم طبقہ اس بات کو جانتا ہے کہ ان

دونوں نے ہی سب سے پہلے رمزؔ عظیم آبادی کے کلام سے قوالی کی محفلوں میں ساز و آواز کے ساتھ حاضرین کو دیوانہ بنانا شروع کیا، جب رمزؔ کا کلام قوالی کی دنیا میں دھوم مچانے لگا تو دھیرے دھیرے اور قوالوں نے بھی ان سے رجوع کیا اور ان سے کلام لے کر قوالی کی محفلوں میں چار چاند لگانے لگے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہندوستان کے گوشے گوشے کے قوال اور قوالہ ان کے پاس آنے لگے اور طرح طرح کے کلام ان سے لکھوانے لگے اور وہ قوالوں کے پیر و مرشد بن بیٹھے۔ ہر قوال ان کو بابا کہہ کر پکارنے لگا اور وہ قوالوں کے بیچ ''رمزؔ بابا'' کے نام سے مشہور ہو گئے.....''۔

(''رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، ص: 23-222)

قوالوں کے درمیان رمزؔ کی مقبولیت اور شہرت کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ وہ اس میدان میں ہر فن مولا تھے۔ وہ کسی بھی مشہور فلمی نغمے کے طرز پر، بہت ہی عمدہ اور موثر کلام لکھ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اردو کے ساتھ ساتھ بھوجپوری، میتھلی اور پوربی میں بھی خوب سے خوب تر کلام لکھنے میں مشاق تھے۔ وہ صرف حمدیہ، نعتیہ، منقبتی اور عاشقانہ کلام ہی لکھنے پر قادر نہ تھے؛ بلکہ گیت اور بھجن بھی لکھنے میں مہارت رکھتے تھے؛ یعنی اس عوامی محفل کی ہر ضرورت کا ان کو خیال تھا، اور ہر طبقے اور ہر مذہب کے سامعین کے دلوں پر راج کرنا ان کا خاصہ تھا۔ رمزؔ نے قوالی کے لیے کثرت سے کلام تخلیق کئے۔ ظاہر ہے اس قدر زودنویسی کے سبب کچھ کلام بہت اچھے اور معیاری نہ ہوں گے؛ لیکن یہ بھی جگ ظاہر ہے کہ ان کے زیادہ تر کلام عوام میں بہت پسند کئے گئے اور آج بھی ان کی قدر و قیمت مسلم ہے۔ ان میں پگلا، جہیز، ٹیکس، پیسہ اور اسٹوڈنٹ لائف جیسی ان کی نظمیں بطور ثبوت کے پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان کے علاوہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ وہ دوسرے مذاہب کے لیے بھی نظمیں لکھا کرتے تھے۔ اس قبیل کی نظموں میں لوکش، شکونی ماما، ستی ساوتری، ستی انسوئیاں اور کوشلیا ہرن کی وغیرہ بہت ہی اہمیت کی حامل ہیں اور یہی بات ان کے صوفیانہ کلام کی تو وہ آج بھی مزاروں اور خانقاہوں کے خاص پروگرام میں پڑھے جاتے ہیں۔ معتقدین سنتے ہیں اور ان پر حال طاری ہوتا ہے۔ رمزؔ کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ قوالی کے کلام اور خالص ادب کے کلام میں فرق کو سمجھتے تھے؛ اس لیے ان کے دوسرے کلام اپنے معیار کے حساب سے بالکل الگ ہیں۔

رمزؔ ایک حق گو، بے باک اور صاف دل شاعر تھے۔ وہ معاشرے کے پسماندہ اور کمزور طبقے کی حمایت کرتے تھے اور غاصب و ظالم طبقوں کو ہدف ملامت بناتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی

شاعری غریب، مظلوم اور استحصال زدہ لوگوں میں زیادہ مقبول تھی۔ اس بابت اظہار خیال کرتے ہوئے سہیل اختر نے لکھا ہے کہ:

"رمزؔ عظیم آبادی کی شاعری چاہے علم وادب کی دنیا میں ہو یا قوالی کی دنیا میں انھوں نے نوابوں، جاگیرداروں، زمینداروں اور سرمایہ داروں کے علاوہ کچلے ہوئے غریبوں، مزدوروں، لاچاروں، محنت کشوں، زمانے کے ٹھکرائے ہوئے انسانوں اور سماج کے روندے ہوئے طبقے کو اپنی شاعری کا خاص موضوع بنایا۔ رمزؔ کی شاعری کا خاص رنگ علم وادب کی دنیا ہو یا قوالی کی دنیا، دونوں میں نظر آتا ہے اور یہی سبب تھا کہ ان کی قوالیاں استحصال زدہ طبقہ میں بہت مشہور ومقبول ہوا کرتی تھیں"۔

("رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن"۔ ص:226-225)

رمزؔ عظیم آبادی ایک شاعر کے ساتھ ساتھ معاشرے کے ایک ذمہ دار فرد بھی تھے؛ اس لیے مقبولیت اور شہرت کے ساتھ ان کے کاندھے پر کچھ گھریلو ذمہ داریاں بھی تھیں۔ مادی ضرورتیں بھی تھیں، جن کو پورا کرنا ان کا فرض تھا۔ ان کی آمدنی بہت قلیل تھی؛ اس لیے انھوں نے اپنی تنگ دستی کو دور کرنے کے لیے قوالوں کے لیے کلام لکھے اور پیسے کمائے؛ لیکن وہ پیسے بھی اتنے نہ تھے کہ وہ عسرت اور غربت کی زندگی سے نجات پا جائیں؛ مگر اس کے باوجود وہ زندگی جینے کے تگ ودو میں آخری سانس تک مصروف رہے اور تخلیق کی نت نئی دنیاؤں کی سیر کرتے رہے۔ آج رمزؔ عظیم آبادی ہمارے درمیاں نہیں رہے؛ لیکن ان کے رمضانی قصیدے اور قوالی کے کلام موجود ہیں، جو ہمیں احساس کراتے ہیں کہ رمزؔ بھلے ہی غربت اور کم مائیگی کا مارا شاعر تھا؛ لیکن وہ تھا اصلی اور فطری فن کار اور اس نے جس میدان میں بھی قدم رکھا اپنا نقش چھوڑا۔

اب ملاحظہ کریں بطور نمونہ ان کی قوالی کے کلام کے کچھ نمونے۔ یہ کلام بھی مرتب نے بہت ہی محنت ومشقت سے مختلف اشخاص کے تعاون سے حاصل کئے ہیں۔ ان کی تعداد گرچہ ہزاروں میں ہے؛ لیکن یہاں کچھ حمد یہ نعتیہ اشعار اور نظموں کے کچھ حصے ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔

حمد

(۱)

اے خدا تو ہی مالک ہے ہر چیز کا   کس طرح کوئی تجھ سے کنارا کرے
کوئی شئے دوجہاں میں نہ قائم رہے   میرے معبود اگر تو اشارا کرے
پھول، شبنم، صبا، چاندنی، آب جو   ابر، قوس قزح، بجلیاں رنگ و بو
تیری بخشش سے جس کو بھی انکار ہو
وہ تری رحمتوں کا نظارہ کرے

❁

ہیں جو پھیلائے ہوئے دستِ طلب تیرے ہیں
اہلِ فن، اہلِ ہنر، اہلِ ادب تیرے ہیں
ایک فاروق پہ موقوف نہیں میرے خدا
جو بھی کونین میں بسے ہیں وہ سب تیرے ہیں
سوز بلبل میں کہ پھولوں میں مہک تیری ہے
شمع کے نور میں، تاروں میں چمک تیری ہے
کوئی بھی چیز نہیں تیری ضیا سے خالی
کعبہ و دیر میں معبود جھلک تیری ہے

❁

تجھ سے ذلت ملے تجھ سے عزت ملے   تجھ سے شہرت ملے تجھ سے راحت ملے
اس کا دنیا میں کوئی ٹھکانہ نہیں   اے خدا جس کو تو بے سہارا کرے
رمزؔ قادر ہے وہ حاکم دوجہاں   اس کی قدرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں
پھول، شبنم، صبا، چاندنی، آب جو   اس کی قدرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں
سنگ ریزوں کو ہیرے کی عظمت ملے
اک ذرے کو روشن ستارا کرے

نعت

(۲)

وہ بیکسوں کا والی دکھیوں کا آسرا ہے
سرکارِ دوجہاں ہے سالارِ انبیاء ہے

وہ تاجدارِ بطحیٰ مہمان عرش اعظم
وہ خواجۂ دوعالم وہ ہادیِ مکرم
انسانیت کا محسن محبوب کبریا ہے

وہ شافع قیامت کونین کا اجالا
وہ آمنہ کا پیارا، وہ کالی کملی والا
لب پہ خلیل کے جو آئی وہی دعا ہے
اس کی زباں پہ ہردم افسانہ آپ کا ہے
عاصی ہے رمزؔ لیکن دیوانہ آپ کا ہے
مرنے کو سرزمیں یہ طیبہ کی ڈھونڈتا ہے

(۳)

چین دل کو نہ آئے گا اے دوستو کملی والے کی وہ انجمن چھوڑ کر
کتنا بدذوق ہے جو کہ فردوس میں جائے طیبہ کے جیسا چمن چھوڑ کر
کچھ شریعت کی تھیں مجھ پہ پابندیاں کچھ تو تیرہ نصیبی کی سازش بھی تھی
اس غریبی نے مجھ کو اجازت نہ دی میں بھی جاتا مدینہ وطن چھوڑ کر
ان کی خوشبو نہ تسکین دے گی ذرا وہ چبھے گی تو لذت ملے گی مجھے
خارِ دشتِ عرب کو اٹھا لوں گا میں نرگس و یاسمیں نسترن چھوڑ کر

کلمہ گو کے لیے توشۂ آخرت اس سے سویا ہوا جاگ جاتا ہے بخت
رمزؔ اب کون جائے غزل کی طرف نعت جیسا یہ رنگِ سخن چھوڑ کر

(۴)

نظم ''ہاتھ''

عروج ہے تو بڑھا خوب دیکھ بھال کر ہاتھ
کہیں نہ پہنچے گریباں تک زوال کے ہاتھ
یہ تاج اور یہ اجنتا، یہ بولتے پتھر
انھیں حیات ملی ہے میرے خیال کے ہاتھ
مصوری ہو، غزل گوئی کہ صنم سازی
کمالِ فن ہے مگر صاحبِ کمال کے ہاتھ
چمن میں ہر جگہ کانٹے ہیں پاسبانی کو
بڑھانا پھول کی جانب مگر سنبھال کے ہاتھ
نہیں ہیں رمزؔ کے چہرہ پہ جھریاں یارو
نشان چھوڑ گئے ہیں یہ ماہ و سال کے ہاتھ
یہ ہاتھ جس میں کہ قرآن کا اجالا ہے
یہ ہاتھ کرشن کی گیتا کا لکھنے والا ہے
یہ ہاتھ چاہے تو دو دوستوں میں ٹھن جائے
یہ ہاتھ چاہے تو دشمن بھی دوست بن جائے
یہ ہاتھ چاہے تو تجھ کو ذلیل و خوار کرے
یہ ہاتھ چاہے تو سارا زمانہ پیار کرے

(۵)

نظم ''آنچل''

پیمبر جس کے سائے میں پلے وہ اور آنچل تھا
فرشتوں کے بھی جس سے پر جلیں وہ اور آنچل تھا
وہ آنچل رابعہ بصری کا ہے زہرا کا آنچل ہے
وہ آنچل حضرت مریم کا ہے سیتا کا آنچل ہے
یہ وہ آنچل ہے جسے عورت کی عزت کا کفن کہئے
یہ وہ آنچل ہے جس کو دشمنِ شام وطن کہئے
یہ وہ آنچل ہے جس سے زندگی پر گھات ہوتی ہے
یہ وہ آنچل ہے جس سے آگ کی برسات ہوتی ہے
اسی آنچل پہ تجھ کو ناز ہے او بے حیا عورت
کہاں اک ناچنے والی کہاں اک پارسا عورت

رمزؔ عظیم آبادی کی نظمیں اور غزلیں جہاں اپنے انفراد اور اختصاص کے سبب حد درجہ مقبول ہیں، وہیں ان کے حمد یہ، نعتیہ، منقبتی اور دوسرے عمومی موضوعات پر تخلیق کردہ کلام بھی کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں، خواہ وہ قوالوں کے لیے ہی کیوں نہ کہے گئے ہوں۔ درج بالا میں رمزؔ کے چند ہی کلام سے کچھ حصے پیش کیے گئے۔ اس انتخاب کا مقصد محض اتنا ہے کہ رمزؔ کے کلام کی انفرادیت اور خصوصیت معلوم کی جائے۔ عام طور سے ارباب ادب قوالی کے کلام کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اسے معیار سے گرا ہوا اور پست تصوّر کرتے ہیں، حالاں کہ قوالی کی دنیا میں معیاری، موثر اور دیرپا کلام کی بھی کمی نہیں ہے۔ قوالی ابتدا سے ہی عوام وخواص میں مقبول رہی ہے؛ لیکن اس کا زوال اس وقت شروع ہوا، جب اسٹیج پر قوال اور قوالہ کو ایک ساتھ مقابلے میں بیٹھا دیا گیا۔ اس نئے رواج سے قوالیوں کے سامعین میں اضافہ تو ضرور ہوا؛ لیکن معیار کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ اس نوع کے

مقابلے میں بازاری اور پھوہڑ زبان کا استعمال ہونے لگا؛ تاکہ بھیڑ کو متاثر کیا جا سکے۔

رمزؔ عظیم آبادی بھی اس مرحلے سے گزرے۔ قوالہ کے مقابلے میں اپنے قوال کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھے۔ جواب الجواب کا دور بھی چلا؛ لیکن وہ کبھی بھی کہیں بھی اپنی سطح سے نیچے نہیں گرے۔ ان کے یہاں جہاں خدا کی قدرت وعظمت کا برملا اور فن کارانہ اظہار ہے، وہ نعتیہ، منقبتی اور صوفیانہ کلام میں بھی اپنی عقیدت کے استحکام کے ساتھ ایستادہ نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ عام سماجی مسائل کو بھی بہت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ پیش کرتے ہیں، خواہ سامعین انھیں بہت پسند کریں، یا نہ کریں۔

یہاں پیش کردہ حمد کو ہی دیکھ لیجئے۔ یہ بالکل عام ڈگر سے ہٹ کر تخلیق کیا گیا ہے۔ قوال کے کلام عام طور سے چھوٹی اور رواں بحر میں ہوتے ہیں؛ لیکن اوپر نقل کیے گئے حمد یہ اشعار بڑی بحر میں ہیں اور زبان واسلوب کے لحاظ سے بھی یہ کسی طرح عمومی حیثیت کے حامل نہیں ہیں۔ اس حمد میں بھی دوسرے شعرا کی طرح خدا کی وحدانیت اور یکتائی کا اعتراف کیا گیا ہے، اسے بحر و بر کا خالق و مالک بتایا گیا ہے، خود کو محتاج اور عاصی اور خدا کو کریم، رحیم اور غفور کہا گیا ہے۔ اسے حاجت روا، مسبب اور ہر شے پر قادر مطلق کہنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ اسی کی بدولت انسان کو عزت اور سرخروئی حاصل ہوتی ہے اور وہی ذلت ورسوائی بھی دینے والا ہے؛ یعنی وہ چاہے تو ذرے کو آسمان کردے اور آسمان کو ذرے میں تبدیل کردے؛ لیکن رمزؔ نے خدا کی ان خصوصیات کو بیان کرنے کے لیے بہت ہی رواں، شستہ اور شگفتہ زبان کا استعمال کیا ہے۔ تواتر اور ارتباط کو نظم کی سب سے بڑی خوبی کا درجہ حاصل ہے۔ رمزؔ کے یہاں یہ خاصہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ لفظیات کی سطح پر اکثر روایتی ڈگر سے احتراز کرتے ہیں اور اپنے عقیدے اور جذبے کو ظاہر کرنے کے لیے ایسے لفظوں کا بھی استعمال کرتے ہیں، جنھیں عام طور سے حمد کہنے والے شعرا جھجکتے ہیں، جیسے کعبہ دیر میں معبود جھلک تیری ہے۔ یہاں دیر میں معبود کی جھلک دیکھنا اپنے آپ میں ایک عجیب وغریب بات ہے؛ لیکن شاعر کی جدت اور فکر کی ندرت اسے بھی خدا کا ہی پرتو مانتی ہے۔

رمزؔ نے بہت سے نعتیہ کلام تخلیق کیے ہیں؛ لیکن یہاں صرف چند اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ یہاں نعت میں شاعر نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور فخرِ انبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بہت ہی والہانہ انداز میں، بہت ہی عمدہ اشعار کہے ہیں۔ یہاں حضور سرکار دوجہاں کو بیکسوں کا والی اور دکھیوں کا غم خوار کہا گیا ہے۔ ساتھ ہی شاعر تمنا کرتا ہے کہ کاش اسے طیبہ کی سرزمین پر مرنے

کے بعد اُسے وہیں کی سرزمین میسر آجائے۔ بہت سادہ اور سلیس زبان میں کہی گئی یہ نعت بہت ہی موثر اور جاذبیت سے بھرپور ہے۔ دوسری نعت میں شاعر کو سرزمین طیبہ سے اس قدر محبت وعقیدت ہے کہ اسے وہ چھوڑ کر فردوس میں بھی نہیں جانا چاہتا اور جو طیبہ کو چھوڑ کر فردوس جانا چاہتے ہیں، شاعر انھیں بدذوق کہتا ہے۔ اس نعت کے دوسرے شعر میں شاعر نے اپنے طیبہ کی زیارت سے محرومی کو شریعت کی پابندی بتایا ہے اور اسے اپنی تیرہ نصیبی کی سازش بھی قرار دیا ہے۔ نعت میں یہ جدت اور ندرت خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہاں یہ سوال ضرور آتا ہے کہ آیا یہ جدت اور ندرت نعت میں مناسب ہے، یا نہیں؟ اس نعت کا آخری مصرعہ بالکل ہی انوکھا اور حیرت انگیز ہے۔ شاعر کے مطابق جو شاعر نعتیہ اشعار کہنے لگے، وہ اسے چھوڑ کر غزل کی طرف کیوں کر جائے گا۔

قوال کی دنیا میں یوں تو رمزؔ کی کئی نظمیں اور گیت مشہور ہوئے؛ لیکن ان کی ایک نظم ''ہاتھ'' بہت مقبول ہوئی۔ یہ غزل کی فارم میں لکھی گئی ہے، چوں کہ یہ ایک موضوع ہے؛ اس لیے اسے نظم کے زمرے میں ہی رکھنا مناسب ہے۔ اس کے اشعار بھی اپنی ندرت اور نادر خیالی کا بین ثبوت ہیں۔ شاعر نے یہاں ہاتھ کو انسان کے کردار اور کوششوں کے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کے مطابق یہ انسان کا کردار اور اس کا عمل ہی ہوتا ہے کہ وہ ترقیوں کے منازل طے کرتا ہے اور دنیا میں سرخرو و سرفراز ہوتا ہے اور انسان کا ایک کردار اور عمل وہ بھی ہوتا ہے، جو اسے ناکامی اور زوال کی تہہ تک پہنچا دیتا ہے۔ شاعر کے مطابق دنیا کے سارے کام، ساری سرگرمیاں اور سارے فنون انسان کی صلاحیت اور کوشش کے محتاج ہوتے ہیں، جو صاحب کمال ہوتے ہیں، وہ ہر میدان اور ہر فن میں یکتائے روزگار ثابت ہوتے ہیں۔ آگے چل کر شاعر نے انسان کے ہاتھ؛ یعنی کردار وعمل کو متعدد مثالوں کے ذریعہ مثبت و منفی معنوں میں پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق یہ ہاتھ دوست کو دشمن بھی بنا سکتا ہے، صحیح کو غلط بھی کر سکتا ہے۔ حق کو باطل اور باطل کو حق بھی بنا سکتا ہے؛ لیکن صحیح معنوں میں اگر یہ بامقصد اور تعمیری ہے تو دنیا میں انقلاب برپا ہوسکتا ہے اور ساری دنیا میں اخوت ومحبت کا ماحول سازگار ہوسکتا ہے۔

رمزؔ کی ایک نظم ''آنچل'' بھی بہت مشہور ہوئی۔ اس کی مقبولیت اس قدر ہے کہ آج بھی قوالوں کے ذریعے کہیں نہ کہیں سننے کو مل جاتی ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے، اور اس کے اشعار عورت کے آنچل؛ یعنی اس کے کردار کا احاطہ کرتے ہیں۔ شاعر کے مطابق یہ آنچل رابعہ بصری اور مریم جیسی

پاک دامن خواتین کا بھی ہوسکتا ہے، جنھوں نے اپنے صالح اور مثالی کردار وعمل سے دنیا کو حق کا راستہ دکھایا اور یہی آنچل ایک بے حیا عورت اور رقاصہ کا بھی ہوسکتا ہے، جو دنیا میں برائی، بے حیائی اور فحاشی کے ذریعے خلفشار اور انتشار پیدا کر سکتا ہے؛ اس لیے نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ عورت کا آنچل بہت محترم اور پاک ہوتا ہے اور عورتوں کو اس کا بھرم ہر حال میں رکھنا چاہیے، لہٰذا یہ صرف قوالی نہیں؛ بلکہ ایک ایسا صالح اور صحت مند پیغام ہے، جسے رمزؔ نے عوام وخواص تک پہنچانے کی کوشش کی اور وہ اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی رہے۔

رمزؔ عظیم آبادی کی نظمیں

رمزؔ عظیم آبادی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں کا کینوس وسیع ہے اور وہ مختلف موضوعات پر بہت ہی روانی اور تسلسل کے ساتھ نظمیں لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں حبِ وطن، طبقاتی کشمکش، فرقہ وارانہ کشیدگی، ظلم و جبر، استحصال، تہذیبی زوال، عصبیت ومنافرت، رجعت پسندی، قلم کی آزادی، قومی یکجہتی، امن کی بحالی، سرمایہ داری کے خلاف احتجاج، انسانی اقدار اور اردو زبان وغیرہ خاص رہے ہیں۔ رمزؔ صاحب نے گرچہ غزلیں بھی اچھی خاصی تعداد میں کہی ہیں اور ان کے دونوں شعری مجموعوں میں وہ شامل بھی ہیں؛ لیکن اصلاً وہ نظموں کے شاعر ہیں اور نظم نگاری میں ان کے خوب خوب جوہر کھل کر سامنے آئے ہیں۔

نظم کی بنیادی ضرورت اور خصوصیت اس کی روانی اور برجستگی ہے۔ ارتباط اور تسلسل ہی خیال کے ارتقا میں سب سے بڑے معاون ہوتے ہیں اور نظم کے خاتمے پر ایک بھرپور مجموعی تاثر چھوڑتا ہے۔ رمزؔ کو نظم کے اس بنیادی وصف پر قدرت حاصل ہے اور اس کے ذریعے وہ بہت ہی آزادانہ طور پر بیباکی کے ساتھ اپنے موقف کے اظہار میں کامیاب رہے ہیں۔ وہ کسی قید و بند اور بندھے ٹکے اصول اور ضابطے کا اتباع نہیں کرتے۔ وہ کھلی فضا میں کھل کر بات کہنے کی جرأت وفطرت رکھتے ہیں۔ ان کے اس وصف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معروف شاعر اور نقاد پروفیسر علیم اللہ حالیؔ نے لکھا ہے کہ:

''....بسا اوقات رمزؔ کو ثقہ شعری اظہار کی حدود سے نکل کر آزاد فضاؤں میں رقص کرتے دیکھا جا سکتا ہے، اس لحاظ سے میں انھیں ایک Gypsy poet سمجھتا ہوں اور اس کی تشریح یوں کرتا ہوں کہ انھوں نے شاعری کی سطح پر کبھی تکلف وتصنع اختیار نہیں کیا۔

کبھی کسی امام کے پیچھے صف باندھ کر مقتدی رہنا پسند نہیں کیا۔ اپنے لیے آزاد شعری فضا کا انتخاب کیا۔ شعری نظام کی نئی روش ایجاد کیا Hamalin کے ساتھ Piedpipar کی طرح سحر آگہی نغمے الاپتے رہے؛ اس لیے ان کی شاعری لامحدود فطرت کا ایک حصہ بن گئی آس پاس کے قارئین کے لیے کچھ اجنبی اجنبی سے؛ مگر دلکشی کا باعث بن گئی''۔

علیم اللہ حالیؔ صاحب کے اس اقتباس سے رمزؔ کی آزاد اور غیر تقلیدی فطرت کا اظہار ہوتا ہے، چوں کہ رمزؔ ایک خودساختہ فنکار تھے اور فطرت نے ان کو طبعِ موزوں ودیعت کی تھی؛ اس لیے وہ اکثر خارجی اثرات سے محفوظ نظر آتے ہیں۔ اوپر کے سطور میں ان کے اساتذہ کے طور پر نظرؔ عظیم آبادی، ثاقبؔ عظیم آبادی، زارؔ عظیم آبادی اور پرویز شاہدی کے نام لیے گئے ہیں؛ لیکن رمزؔ نے کسی استاد کا رنگ سخن اپنانے سے اجتناب برتا اور اگر کسی استاد سے مرعوب بھی ہوئے تو تھوڑے وقفے کے لیے اور پھر وہ واپس اپنی خاصی اور نجی روش پر گامزن ہو گئے۔

شاعری میں رمزؔ کو نہ روایت کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے اور نہ ترقی پسندی اور جدت کے۔ پرویز شاہدی سے قربت کے سبب ان کے یہاں مارکس کے افکار کی جھلک تو دکھتی ہے؛ لیکن رمزؔ کے یہاں یہ شے ان کے معاشرے کے چلن اور اس کے ردعمل کے طور پر آئی ہے۔ رمزؔ دراصل انحراف کے شاعر ہیں اور یہ بات ان کی نظموں کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوجاتی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ہر طرح کی ستھری روایات سے انکار کیا ہے اور اپنے خیال کے اظہار کے لیے ایک بالکل نئی طرح ڈالی ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالیؔ نے اپنے اسی مضمون، جس کا اقتباس ابھی پیش کیا گیا ہے، میں لکھا ہے کہ:

''انحراف، رومان اور فطرت ان کی شاعری کے بنیادی اجزا ہیں۔ ان کی ذہن اُپج اور اظہار کی ہے۔ تنہا پن نے جامد اور غیر لچیلے موضوعات میں بھی دلکشی پیدا کر دی ہے، اس طرح انھوں نے مملکت سخن کی سرحدوں کی توسیع کی ہے۔ رمزؔ نے کتابوں اور صحبتوں سے شاعری نہیں سیکھی تھی؛ بلکہ یہ جذبہ انھیں مبدأ فیاض سے عطا ہوا تھا۔ انھوں نے عشق اور رومان کی فضا میں سانس ہی لیا تھا؛ بلکہ جسمانی محنت و مشقت کرکے دو وقت کی روٹی مہیا کرنے میں اپنی نوجوانی کا کوئی سرمایۂ افتخار تھا، نہ ان کی چھوڑی ہوئی دولت۔ وہ ہمیشہ نامساعدی حالات سے مقابلہ کرتے رہے۔ ان کے شعری محرکات آسودہ حال طبقے سے یکسر مختلف تھے۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ بلا شبہ عصری میلانات اور واقعات کا ترجمان ہے؛ لیکن اپنے لہجے کی لطافت سے انھوں نے اس میں رنگ

دوام پیدا کر دیا ہے۔ رمزؔ اگر ہماری شعری تاریخ کا ایک روشن حصہ ہیں تو دوسری طرف ان کی فنکارانہ شخصیت سے ایک نئی تاریخ کی ابتداء بھی ہوتی ہے''۔

(''رمزؔ عظیم آبادی فنکارانہ مرتبہ''، ''رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن'' ص:35-32)

پروفیسر علیم اللہ حالیؔ نے رمزؔ کی شاعری کی روح کو پکڑنے کی کوشش کی ہے اور اخیر میں جو نتائج اخذ کئے ہیں۔ ان سے کلیتاً اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ رمزؔ اپنے معاصرین میں سب سے الگ اور منفرد لب ولہجہ لے کر آئے تھے۔ ان کے یہاں کوئی بناوٹ، کوئی ملمع، کوئی مصلحت اور کوئی تقلید نہ تھا۔ وہ اپنے انداز کے تنہا شاعر تھے۔ وہ چوں کہ غربت اور مفلوک الحالی کی مار سہہ کر میدان شعر وسخن میں آئے تھے؛ اس لیے ان کے یہاں تکلف اور سج دھج سے گریز ملتا ہے۔ وہ حد درجہ حساس واقع ہوئے؛ اس لیے معاشرے میں جو کچھ دیکھتے تھے، مشاہدہ کرتے تھے، اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔

رمزؔ کے نظمیہ سرمایے پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ ان کی متعدد نظمیں عوام وخواص میں بہت مقبول ہوئیں۔ ان میں تاج، زمین اور عورت وغیرہ سامنے کی مثالیں ہیں۔ یہ نظمیں اپنے موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنی مشہور زمانہ نظم ''تاج'' کو محبت کی نشانی ضرور مانا؛ لیکن سب سے زیادہ اہمیت ان مزدوروں کو جانا، ان معماروں کو اہمیت دی، جنھوں نے اپنا خون پسینہ بہا کر اپنی عمارت کھڑی کر دی، جو دنیا میں آج بھی اپنی مثال آپ ہے۔ رمزؔ کے مطابق تاج محل کو پیسے کے زور پر بھلے ہی سلطنت شاہ جہاں نے تعمیر کروایا؛ لیکن اس پر سب سے پہلا حق ان مزدوروں اور معماروں کا ہے، جنھوں نے اسے بنایا۔ اس نظم کے کچھ حصے ملاحظہ کریں:

تاج ہے محنت کشوں کی یادگار
فکر کی جنت مشقت کا وقار
کتنی پیشانی کا در شاہ سوار
علم و صنعت کا حسیں آئینہ دار
یہ مرقع ہے کسی کے پیار کا
تاج پر حق ہے مگر فنکار کا

رمزؔ سے پہلے ساحرؔ کی نظم کافی مقبول ہو چکی تھی؛ اس لیے عام طور پر یہ خیال تھا کہ ساحرؔ کی اتنی معرکتہ الآرا نظم کے بعد رمزؔ کی اس نظم کا کوئی جواز نہیں ہے؛ لیکن رمزؔ نے اس کا خوب جواز پیش کیا۔ ساحرؔ اور رمزؔ دونوں کے خیال میں اشتراکی عناصر ہیں؛ لیکن کچھ واضح فرق کے ساتھ، چوں کہ رمزؔ نے

اشتراکیت سے استفادہ کرتے ہوئے مزدوروں، محنت کشوں کی عظمت کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے اور تاج پر انھیں کے حق کی حمایت کی ہے؛ اس لیے یہ نظم ساحرؔ کی نظم سے بالکل جدا اور منفرد ہو گئی ہے۔

ہوتے ہی شب کے اس پر دام صبح
تاج کا دامن میں چھلکا جام صبح
ذرہ ذرہ کو ملا پیغام صبح
یہ گماں دل کو ہرا ہنگامِ صبح
جب کلی چٹکی کوئی آواز سے
جاگ اٹھی ممتاز خواب ناز سے
یاد ہیں وہ جگمگاتی انگلیاں
پتھروں کو گد گداتی انگلیاں
بربعا فن کو بجاتی انگلیاں
سنگ میں جادو جگاتی انگلیاں
انگلیوں سے خون ٹپک کر رہ گیا
آسماں کا دل دھڑک کر رہ گیا

نظم ''تاج'' اور ''ستر سال کی بڑھیا ناگن'' رمزؔ کے دونوں مجموعے میں سے کسی میں شامل نہیں ہیں؛ لیکن اس سے ان کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔

رمزؔ کا پہلا مجموعہ ''نغمۂ سنگ'' 1988ء میں بہار اردو اکیڈمی کے توسط سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا، اس مجموعے میں شامل نظموں پر ایک غائر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ ابتدا تا آخر ایک تسلسل ہے وقت اور زمانے کا جو صاف طور پر رمزؔ کے مزاج اور حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ پہلی نظم ''چاند کو چھونے کا قصہ'' اس کے بعد ''صبح تمنا'' اور ''اس عہد کا المیہ'' تسلسل کے ساتھ کسی شاعر کی فکر کا ارتقا بھی ہے اور ابتدا تا آخر زندگی کا بتدریج بدلتا ہوا منظر نامہ بھی ہے۔

''نغمہ رنگ'' میں ان کی بہترین نظمیں شامل ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ نظمیں محض تفنن طبع اور دل بستگی کا سامان نہیں ہیں؛ بلکہ زندگی کے تلخ حقائق کا آئینہ دار بھی ہیں۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں 'صبح تمنا، رومان سے حقیقت تک، زندگی، عورت، یقین، رقص حیات، نیا دور، مسیح وصلیب اور ''شام وطن''، جیسی نظمیں بھی ہیں، جو کسی نہ کسی طور پر فنی اور فکری سطح پر رمزؔ کو ایک بڑا نظم گو

شاعر ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں، جیسا کہ اوپر کے سطور میں عرض کیا گیا کہ اس مجموعے کی پہلی نظم ''چاند کو چھونے کا قصہ'' ہے۔ بشیر احمد کے مطابق یہ نظم دراصل ''اسپوتنک'' کے ''اورنگ سلیمان'' ہونے کی داستان ہے۔ نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے:

عہد طفلی کی تمنا کامراں ہونے کو ہے
فاتح سیارگاں عزم جواں ہونے کو ہے
میری گرد راہ بزم کہکشاں ہونے کو ہے
خاک کا پتلا خلا کا راز داں ہونے کو ہے
ایک حقیقت بن گئی ہے کل کے افسانے کی بات
چاند کو چھونے کا قصہ چاند کو پانے کی بات

دس بند میں شاعر نے اظہار مسرت کرتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ جو خواب عہد طفلی میں اس نے دیکھے تھے آگے چل کر اس کی تعبیر بھی سامنے آئی اور انسان ستاروں پر کمندیں ڈالنے لگا۔ نئی نئی سائنسی فتوحات کے ذریعے خلاؤں پر حکمراں کرنے لگا؛ یعنی یہ تاریخ انسان کا ایک مثالی ارتقا ہے اور اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے؛ لیکن اس کیساتھ ہی کچھ فکر مندی کی باتیں بھی ہیں۔ اسی انسان نے جہاں اتنی ترقی کی اور انسان کے لیے نئی نئی ایجادات کو انجام دیا، اسی نے اس دنیا کو جہنم بھی بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ طرح طرح کے بم، اسٹیم بم اور انسان کش اسلحوں کی ایجاد نے پوری دنیا کے باشندوں کو موت کے دہانے تک پہنچا دیا۔ انسانیت تار تار ہونے لگیں اور تمام تر صالح اور صحت مند قدریں زوال آمادہ ہوگئیں۔ شاعر نے انساں کی اس ترقی کو حد درجہ مضر اور غیر انسانی قرار دیا ہے ساتھ ہی یہ تشویش بھی ظاہر کیا ہے کہ کہیں قدرت برہم ہو کر چاند کو دو حصوں میں نہ تقسیم کر دے۔ ملاحظہ کریں:

کوریا والوں پہ وہ عہد کرم بھی یاد ہے
ناگاساکی، ہیروشیما کا ستم بھی یاد ہے
عصمتیں لوٹی گئیں اور چھاتیاں کاٹی گئیں
آدمی کی لاش سے کل خندقیں پاٹی گئیں

سوچتا ہوں اس ترقی کا نہ یہ انجام ہو
چاند کی کرنیں ہوں، زہریلی، بھیانک شام ہو

وسعت جلوہ سمٹ جائے زمیں رسوا نہ ہو
چاند دو حصوں میں بٹ جائے کہیں ایسا نہ ہو

''صبح تمنا'' نغمۂ سنگ کی دوسری اور بہت ہی اہم نظم ہے۔ ہندوستان میں آزادی کا خواب سب نے مل کر دیکھا تھا۔ مسلمان اس میں پیش پیش تھے؛ لیکن آزادی ملنے پر ایک دفعہ پھر انھیں سر کٹانا پڑا اور اس دفعہ کاٹنے والے خود ان کے ہم وطن تھے۔ تقسیم ملک کے ساتھ ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور اسی کے ساتھ فسادات اور خون خرابے کا وہ سلسلہ شروع کیا گیا، جسے دیکھ کر انسانیت بھی شرمسار ہو جائے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان جانے والے مسلمانوں کو ٹرین روک روک ڈبوں میں گھس کر قتل عام کیا گیا، یہاں تک کہ عورتیں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ تاریخ کا وہ خونی باب آج بھی موجود ہے اور اس کے اثرات فنکاروں کے ذہن و دل پر آج بھی تازہ ہیں۔ رمز صاحب نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نظم کو نہ صرف یادگار بنا دیا ہے؛ بلکہ مسلمانوں پر ہوئے ظلم و ستم کا جیتا جاگتا مرقع بھی پیش کر دیا ہے۔ شاعر کے مطابق جس صبح آزادی کا صدیوں سے انتظار تھا، وہ آئی تو قتل و غارت گری کی سوغات لے کر آئی، یہاں ''صبح تمنا'' کے دو بند ملاحظہ کریں:

سہمی ہوئی کلی ہے نگہہ دار کون ہے؟
مایوس زندگی ہے خطا وار کون ہے؟
مجروح قلب امن ہے تلوار کون ہے؟
اب دیکھنا ہے یہ کہ سردار کون ہے؟
دل میں ہزاروں زخم ہیں، ناسور ہی نہیں
میری نظر میں صرف جبل پور ہی نہیں
قاتل کھڑا ہے وقت کے منصب کے روبرو
دامان و آستیں میں چھپائے ہوئے لہو
لہجہ بہت حسین ہے، معصوم گفتگو
انصاف کی نگاہ میں بنتا ہے سرخرو
صورت کچھ آشنا سی ہے، پہچانتا ہوں میں
صدیاں گزر گئی ہیں؛ مگر جانتا ہوں میں

اس نظم کے دوسرے بندوں میں شاعر نے فرقہ پرستی اور قتل و غارت گری کو عالمی سطح پر دیکھنے کی کوشش کی ہے اور دنیا میں جہاں بھی انسانی لہو بہانے کا کام ہوا تھا اور جس نے کیا تھا، اس کی بھرپور اور بے لاگ مذمت کی ہے؛ لیکن اس کے باوجود شاعر کے یہاں اب بھی امید و بیم کی لوئیں بجھی نہیں ہیں اور وہ بہت ہی آس او امید بھرے لہجے میں آج بھی ''صبح تمنا'' کا منتظر ہے؛ لیکن ویسی صبح تمنا کی نہیں جیسی کہ اس پر گزر چکی ہے ۔

پھر اہتمام دارورسن ہے صلیب ہے
بڑھتے چلو کہ صبح تمنا قریب ہے

یا یہ امید افزا شعر کہ ۔

تحریک کب حریت کو جفا کیا دبائے گی
مسلے ہوئے گلاب کی خوشبو نہ جائے گی

اسی قبیل کی ایک نظم ''حدیث معتبر'' بھی ہے۔ ملکِ عزیز میں ہر طرح کی عصبیت کے ساتھ لسانی عصبیت اور امتیاز بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ یہ پہلے بھی مسئلہ تھا اور آج بھی مسئلہ ہے۔ اردو اپنے آغاز سے مذہبی ہم آہنگی، قومی یک جہتی اور پیار و محبت کی زبان رہی ہے، اس زبان نے ہر زمانے میں انسانیت اور بھائی چارہ کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا ہے؛ لیکن نفرت کی سیاست کرنے والوں نے اسے ہمیشہ نقصان پہنچانے کا کام کیا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

شاعر نے اردو کی تاریخ اور اس کی شناخت کی بابت اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ اردو خالصتاً ہندوستان کی زبان ہے۔ یہ اپنی کشش اور شیرینی کے سبب جہاں صوفیاء کرام کی قربت میں رہی، وہیں اسے ریشیوں اور سنتوں نے بھی دُلار، پیار کی۔ اپنی بڑی بہن ہندی سے اسے ہمہ دم بے پناہ محبت رہی۔ یہ ہماری مشترکہ اور گنگا جمنی تہذیب کی سب سے بڑی علامت رہی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں اس کی دھوم ہے۔ اردو نے ہر مذہب اور ہر طبقے کا احترام کرنا سکھایا ہے، یہی وجہ ہے کہ شیخ و برہمن سب اسے دل و جان سے چاہتے ہیں، اس کی آواز میں وہ شیرینی و چاشنی ہے کہ ہر محفل میں سب اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہ باخبر بھی ہے، ملک اور بیرون ملک کے حالات پر اس کی نظر ہے اور وقت بہ وقت اپنے چاہنے والوں کو موثر انداز میں باخبر بھی کرتی رہتی ہے؛ یعنی ایک طرف اردو اگر اپنی نزاکت اور حلاوت کے لیے جانی جاتی ہے تو دوسری طرف یہ اپنے انقلابی پیغامات اور دشمن سے لوہا لینے کی ترغیب کے لیے بھی پہچانی جاتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی

مثال تحریک آزادیٔ ہند میں اس کے کارنامے ہیں؛ لیکن تمام قربانیوں کے باوجود یہ زبان ہمیشہ معتوب رہی اور اس پر عتاب اور تعصب کا کالا سایہ اس وقت اور مہیب ہونے لگا، جب ملک تقسیم ہو گیا۔ شاعر نے نظم کے اخیر میں اردو کے کرب کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

نجدی نہیں ترکی نہیں   ہندی ہوں میں ایران میں
کس طرح ہو میرا وطن   لاہور میں ملتان میں
میں بھی مہاجر کی طرح   پہونچی تھی پاکستان میں
یوں رہزنِ تقسیم نے   لوٹا ہے میرا کارواں
ہندوستاں میرا وطن
میرا وطن ہندوستاں

دورِ غلامی میں رہی   میں بھی پرستارِ وطن
میں نے بھی خوں دے کر کیا   شاداب رخسار وطن
میر ابھی حق ہے ملک پر   میں بھی ہوں معمارِ وطن
اے رہنمایان وطن   میں ہوں وہی اردو زباں
ہندوستاں میرا وطن
میرا وطن ہندوستاں

رمزؔ نے اس نظم کے ذریعے اردو زبان کی نہ صرف خوبیاں بتائیں ہیں؛ بلکہ اس کے ساتھ ہو رہی ناانصافیوں کو بھی واضح لفظوں میں اجاگر کر دیا ہے۔ چھوٹی اور رواں بحر کی یہ نظم اپنے موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے ایک منفرد اور یادگار تخلیق ہے اور بقول شخصے اسے اردو والوں کا ترانہ ہونا چاہیے تھا؛ لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا۔

''نغمۂ سنگ'' میں شامل ایک نظم ''کاغذ کے پھول'' بھی ہے۔ یہ بہت ہی رواں، پُر کشش اور فکر انگیز نظم ہے۔ اس میں نہ صرف شاعر کی جولانی طبع شباب پر ہے؛ بلکہ محبوب کی آرائش و زیبائش کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھنے کی سعی ہے۔ آغاز کا یہ بند ملاحظہ کریں:

میرا موضوع سخن، میرے قلم کا جادو
تیری زلفوں کی مہک تیرے بدن کی خوشبو

میری تخیل میں تابندگیِ عارض و لب
میرے انفاس کی گرمی، تیرے چہرے کا جلال
عہدِ ماضی کے دھندلکوں سے ابھری تصویر
میرے احساس کی شوخی ترا وا رفتہ خیال

نظم کی ابتدا کے بعد آگے کے تمام بندوں کو پڑھیے تو اخیر میں اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے محبوب کی وعدہ شکنی سے نالاں ہے؛ کیوں کہ اس نے طلائی زنجیر پہن رکھی ہے، وہ غالیچوں پر چلنا پسند کرتی ہے، اسے آرائش و زیبائش کے ساتھ آرام و آرائش سے بھی شغف ہے؛ لیکن عاشق تو کانٹوں پر چلنا چاہتا ہے۔ وہ دنیا کے ہر رنج و غم اور آزمائش سے گزرتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے محبوب کو ہر حال میں چاہتا ہے اور اس کی جدائی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ محبوب سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے ۔

تو کہ پابندیِ آدابِ ستم سے خوش ہے
اور بخشا ہے محبت نے یہ اعجاز مجھے
کاغذی پھول تری بزم کی زینت کیا خوب
جو کلی کھلتی ہے دے دیتی ہے آواز مجھے

پھر آگے چل کر وہ شکوہ کرتا ہے کہ:

آج بھی یہ ترے ماحول سے شکوہ ہے مجھے
شمعِ محفل تو بنی، شمعِ حرم بن نہ سکی
وائے تقدیر کہ لاکھوں ہیں پجاری لیکن
جس کے قدموں میں جھکے سر وہ صنم بن نہ سکی

ایک مرجھائے ہوئے پھولوں کا گلدستہ ہے
نازکِ غم ترے سینے میں بھی پیوستہ ہے

شاعر زندگی کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہے۔ وہ رنج و غم سے آشنا ہے۔ وہ ہر ستم سہنا جانتا ہے۔ اس محبوب سے لاکھ شکوہ سہی؛ لیکن پھر بھی وہ اسے نظر انداز نہیں کرسکتا اور اسے اس بات کا احساس ہے کہ محبوب کو کہیں نہ کہیں شرمندگی کا احساس ضرور ہے۔ ۔

تو مجھے دیکھ کر آنکھوں کو چرا لیتی ہے
تو نے گو چھپ کے ندامت سے بہایا آنسو

رمزؔ کی نظموں میں ایک بہت ہی اہم اور خوبصورت نظم ''مقدس فرض'' بھی ہے۔ یہاں شاعر نے غمِ جاناں اور غمِ دوراں جیسے نجی حالات سے الگ ہٹ کر ملک کی روز بروز بگڑتی ہوئی صورتحال اور اس کی سنگینی پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ساتھ ہی وہ شاعری کو ''مقدس فرض'' تصور کرتے ہوئے تلخ حقائق کی نقاب کشائی بھی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ملاحظہ کریں:

جدھر دیکھو ہوس گاہیں کھلی ہیں
اجالے خود رفیقِ تیرگی ہیں
مصیبت درس گاہیں بن گئی ہیں
متاعِ علم و دانش لٹ نہ جائے
کہ اس ماحول میں دم گھٹ نہ جائے

اور پھر آگے چل کر شاعر کا یہ پیغام دیکھیں ۔

رجز کو شعر و نغمہ میں بدل دو
شبِ بارود کو شامِ غزل کر دو

❀

سروں پر تاج کانٹوں کا سجالو
صلیبیں اپنے کاندھوں پر اٹھالو

اس نظم کے ذریعے رمزؔ عظیم آبادی نے قلم کی تقدس اور اس کے تحفظ پر زور دیتے ہوئے یہ باور کرانا چاہا ہے کہ قلم کے ذریعے ہر جنگ لڑی جاسکتی ہے اور ملک میں امن و امان کا ماحول سازگار کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اس میں خطرات بھی ہیں اور ان سے نبرد آزما ہونا قلم کاروں کا اوّلین فرض ہے؛ اس لیے وہ اخیر کے بندوں میں صاف طور پر قلم کاروں کو للکارتے ہوئے ان کے فرضِ منصبی سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قلم کاروں کو اب پوری طرح بیدار ہو جانا چاہیے؛ کیوں کہ دیر ہونے پر یہ خدشہ ہے کہ کہیں قلم نفرت کا حامی نہ بن جائے، کہیں یہ تجارت نہ ہو کر رہ جائے، کہیں یہ سیاست کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بن کر رہ جائے؛ اس لیے قلم کے تقدس کو بچانے کے لیے محبت کو عام کرنا ضروری ہے، اسے پیغامبرِ امن و امان بنانا لازمی ہے۔ نظم کے آخری بند میں اتمامِ حجت کے طور پر یہ مصرعے ملاحظہ کریں:

عزیز، دوستو اے کامگارو
ادیب و شاعرو نغمہ نگارو

سیاسی رہنماؤ، شہر یارو
عروس امن کی زلفیں سنوارو
یہ حسن زندگی کا قرض بھی ہے
رفیقو یہ مقدس فرض بھی ہے

رمزؔ عظیم آبادی کی معروف نظموں میں ''مسیح وصلیب'' کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔اس نظم کے ذریعہ انھوں نے پوری دنیا کو امن وسلامتی کا پیغام دیا ہے اوران جابر، غاصب اورامن دشمن طاقتوں کو ہدف ملامت بنایا ہے۔وہ یورپ کی مشینی زندگی اور حد درجہ بڑھی ہوئی بے حسی اور بے رحمی کو لعن طعن کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دبی ہوئی ہے مشینوں میں وقت کی آواز
فضا میں تیرتا پھرتا ہے ''آہنی'' شہباز
ابھی کہاں ہے فرشتوں کو جرأت پرواز
پہنچنے والا شیطاں قریب پردۂ راز
نہ بتکدہ، نہ حرم میں نہ خانقاہوں میں
ہے جشن موت کا یورپ کی رقص گاہوں میں

رمزؔ کا ماننا ہے کہ جب ایشیا کی روحانیت پرضرب کاری کی کوشش کی گئی ہے، اس وقت مشینی شیطانوں کو ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا ہے اور زندگی ہر حال میں زندہ دل کے ساتھ باقی رہی ہے؛ یعنی صلیب پر چڑھ کر بھی مسیحائی ہمیشہ زندہ رہی ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ایشیا کی سرزمین ہمیشہ سے صوفی سنتوں کی سرزمین رہی ہے اوران صوفی سنتوں نے صدیوں سے اس خطے کو امن وآشتی کا پاٹھ پڑھایا ہے۔آپسی اخوت وآہنگی کو فروغ دیا ہے؛ تاکہ ہماری مشترکہ تہذیب وثقافت ہر حال میں باقی رہے۔رمزؔ نے اس نظم میں ان خصوصیات کی طرف واضح اشارہ کئے ہیں:

کبھی جو محفل روحانیاں پہ آنچ آئی
ہوئی ہے عقل کی بزم جنوں میں رسوائی
کچھ اور تیز ہوئی زندگی کی رعنائی
صلیب پاکے بھی زندہ رہی مسیحائی

''نغمۂ سنگ'' میں اس کے علاوہ کئی دوسری نظمیں بھی ہیں، جو کافی اہمیت کی حامل ہیں۔اس

میں شامل ۴۲ نظموں میں سے کسی بھی نظم کا مطالعہ کیا جائے، اس سے رمزؔ کی فکر اور مزاج کو بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔رمزؔ کو بہت آسانی سے کبھی روایتی تو کبھی اشتراکی شاعر کہہ دیا جاتا ہے، جب کہ سچ یہ ہے کہ رمزؔ اپنے جذبات واحساس کے شاعر ہیں۔وہ اعلیٰ انسانی اقدار، امن عالم، وطن دوستی اور اخوت وہم آہنگی کو ہر مقام پر اوّلیت دیتے ہیں۔یہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے کہ ان کے یہاں اپنے قارئین اور سامعین کی تفریح طبع اور دل بستگیٔ خاطر کے مقصد سے کچھ، تخلیق نہیں کیا گیا ہے۔رمزؔ کی شاعری کا ایک مشن ہے، ایک پیغام ہے، جسے وہ اپنی منظومات، غزلیات یا قطعات ورباعیات کے ذریعے عام کرنا چاہتے ہیں۔

رمزؔ کے دوسرے مجموعۂ کلام ''شاخ زیتون'' میں بھی ایک درجن نظمیں شامل ہیں۔اس مجموعے کے مرتبین سید فیاض الرحمٰن اور معین کوثر نے اسے ادبی مرکز، پٹنہ کے زیراہتمام 1998ء میں شائع کرایا۔اس مجموعے کی مشمولات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرتبین نے کافی کدوکاوش کے ساتھ اسے بہترین اور معیاری انداز میں پیش کیا ہے؛ مگر ''شاخ زیتون'' کی اشاعت کے ساتھ ہی رمزؔ کا شعری سرمایہ ختم ہوجاتا ہے۔یہاں یہ بات حیرت میں ڈالنے والی ہے کہ اس قدر پُرگو اور زودگو شاعر کے بس اتنے ہی کلام سامنے آسکیں! بقیہ کلام آخر کیا ہوئے؟ کیا وہ ضائع ہوگئے، یا بعض ہم عصروں میں شیرنی کی طرح بٹ گئے، اس تشویش کا مختصر سا جواب مرتبین نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رمزؔ کے اطراف میں رہنے والے اشخاص بھی رمزؔ کو نقصان پہنچانے سے باز نہیں آئے اوران کے زیادہ تر کلام غائب کردیئے گئے۔ملاحظہ کریں:

''رمزؔ عظیم آبادی کی رحلت سے چند سال قبل ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے والے کسی بے ادب نے ان کی ایک ڈائری اڑائی، جس میں ان کی متعدد نظمیں اور غزلیں تھیں۔بلاشبہ یہ مذموم حرکت نا قابل فراموش سانحہ تھی''۔

(''شاخ زیتون''، عرض حال، مرتبین: ص:8)

بہر حال ان کے کلام کی چوری کسی ایک شخص نے کی، یا بہتوں نے کی، یہ ایک معمہ ہے، جسے شاید ہی اب سلجھایا جاسکے؛ لیکن ان کے دونوں مجموعوں میں اب بھی جو کلام شامل ہیں، وہ رمزؔ کی شناخت اوراہمیت کو مستحکم کرنے کے لیے کافی ہیں۔

جہاں تک ''شاخ زیتون'' میں شامل نظموں کی بات ہے تو یہاں بھی رمزؔ کی نظمیہ شاعری کی تمام تر خصوصیات موجود ہیں۔ان نظموں کے غائر مطالعے سے صاف طور پراندازہ کیا جاسکتا ہے کہ

یہ نہ صرف موضوعاتی سطح پر؛ بلکہ فنی سطح پر بھی اپنے مخصوص انفراد اور امتیاز کے ساتھ قارئین پر آج بھی اثر انداز ہونے کی بھرپور قوت رکھتے ہیں۔

رمزؔ عظیم آبادی کو اکثر اشتراکی سمجھا جاتا رہا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ مارکس اور اینگلز کو جانتے تھے اور نہ جدلیاتی مادیت کو۔ ان کے یہاں سماجی نابرابری اور ظلم و استحصال کے خلاف ایک توانا آواز ہے، جسے پرویز شاہدی سے قربت کے سبب اشتراکی سمجھ لیا گیا، جب کہ اصل صورتحال یہ ہے کہ رمزؔ خدا کی وحدت کو تسلیم کرتے تھے اور مذہب اسلام کو دنیا کا سب سے بہتر مذہب مانتے تھے۔ اس کا بین ثبوت ''شاخ زیتون'' میں شامل ان کی نظمیں معراج، طلوع اسلام، رحمت جزوکل، جلوہ ہی جلوہ اور بعد از خدا بزرگ توئی ہے۔ ان نظموں کے متعلق ڈاکٹر عبدالمغنی کا اقتباس ملاحظہ کریں:

''ظاہر ہے کہ یہ سب اسلامی موضوعات ہیں اور نعتیہ کلام کے نمونے۔ ان سے رمزؔ کی اسلام پسندی اور حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نمایاں ہے۔ بہرحال یہ تخلیقات فن کے اعتبار سے بھی بلند ہیں، جس طرح دیگر عام موضوعات پر ان کی نظمیں ہیں۔۔۔''۔

(''شاخ زیتون''۔''رمزؔ عظیم آبادی کی شاعری''۔ص:16)

اب مذکورہ نظموں سے ایک ایک بند ملاحظہ کریں؛ تاکہ اوپر پیش کیے گئے دعوے کی دلیل فراہم ہو۔

چمک ہے عرش اعظم کی نبوت کے نگینے میں
متاعِ دین و دنیا ہے محمدؐ کے خزینے میں
عرب کیا ہے عجم کا درد بھی رکھتے ہیں سینے میں
نظر ساری خدائی پر مگر گھر ہے مدینے میں
وہ شام ہو ایشیا ہو یا کہ ہو یورپ رد نہیں کرتی
ہوا چلتی ہے تو پابندیٔ سرحد نہیں کرتی

(''رحمتِ جزوکل''۔''شاخ زیتون'')

خدا کو رحم آیا چہرۂ گیتی پہ نور آیا
سمٹ کر ارض بطحیٰ میں جمال کوہِ طور آیا
دکھی انسانیت کو پھر سے جینے کا شعور آیا
شراب معرفت چھلکی دماغوں میں سرور آیا
طبیب آیا مریض وقت کو بستر سے ہوش آیا

وہ نورِ اوّلیں صلی علیٰ رحمت بدوش آیا

(''طلوعِ اسلام''۔شاخ زیتون)

کہا آدم نے فرزند مکرم کملی والا ہے
لبِ عیسیٰ پہ تھا نور مجسم کملی والا ہے
خلیل اللہ بولے جان علم کملی والا ہے
فلک بولا وقارِ ابنِ آدم کملی والا ہے
ستاروں نے کہا نبیوں کا پیرِ کارواں کہیئے
محمد مصطفیٰ کو وجہ صوتِ کن فکاں کہیئے

(''معراج''۔شاخ زیتون)

نبی کے آنے سے دشتِ عرب ہوا
تہی نظر نہیں آتا کسی کا دستِ سوال
یہ ہے نقوش کف پائے مصطفیٰ کا کمال
رواں ہے سونے کا دریا بصورتِ سیال
اٹھا کے دیکھ لو ہر ذرہ اک نگینہ ہے
جہاں خدا کا خزانہ ہے وہ مدینہ ہے

(''بعد از خدا بزرگ توئی''، شاخ زیتون)

یہاں نقل کیے گئے نظموں کے بندوں سے واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ رمزؔ جذبۂ اسلامی سے سرشار ہیں۔ انھوں نے مدحِ رسولؐ میں جس قدر عقیدت و محبت سے لبریز اشعار کہے ہیں، وہ اپنے آپ میں مثال ہے۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علکیہ وسلم کی آمد کو پوری دنیا کے لیے باعثِ رحمت تصور کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کو جب دنیا والوں پر رحم آیا تو اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے درمیاں بھیجا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے ساتھ ہی ساری ظلمتیں مٹ گئیں، ظلم واستبداد اور کفر والحاد کا سلسلہ ختم ہوگیا اور چاروں طرف حق اور انصاف کا اجالا پھیل گیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و مرتبہ کا اعتراف تمام انبیا نے کیا اور انھیں دنیا کا پیرِ کارواں تسلیم کیا اور اس میرِ کارواں نے دنیا کو جو پیغام دیا، وہ نہ صرف انسان؛ بلکہ پوری انسانیت کے لیے ایک عظیم تحفہ ثابت ہوا، ہر انسان اپنے وجود کا مقصد سمجھنے لگا، نیک و بد میں تمیز کرنے لگا اور پھر خدا کی رحمتوں سے فیض یاب ہونے لگا۔ یہ سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے

سبب ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت اللعالمین کہا گیا اور اس میں صرف مذہب اسلام کی قید نہیں؛ بلکہ ساری دنیا اس چشمہ فیض سے سیراب ہوئی ہے اور رہتی دنیا تک سیراب ہوتی رہے گی۔

رمزؔ کی حمد یہ شاعری ہو یا نعتیہ، ہر جگہ ایک وفور، ایک ولولہ اور شدت عقیدہ کا ایک خوشگوار جھونکا محسوس ہوتا ہے اور شدت سے یہ احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ وہ ایک سچے عاشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے۔ میری دانست میں رمزؔ کی شاعری کا مطالعہ ان کی اس قبیل کی نظموں کو چھوڑ کر کبھی بھی مکمل نہیں ہوسکتا۔

''شاخِ زیتون'' میں شامل ان کی ایک نظم ''تاریخ کا المیہ'' بھی ہے۔ اس نظم کے ذریعے شاعر نے گزرے وقتوں کی خونچکاں داستان رقم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انسانی تاریخ کشت وخون سے بھری ہوئی ہے۔ دنیا میں اقتدار اور جاہ وحشمت حاصل کرنے کے لیے غاصب اور جابر حکمرانوں نے انسانی جانوں کی پرواہ نہ کی اور لاکھوں کی تعداد میں معصوموں کی زندگیوں کو روند ڈالا۔ کتنی عورتیں بیوہ ہوگئیں، کتنے بچے والدین کے سایے سے محروم ہوگئے، پھر بھی اقتدار کے ہوس کاروں نے یہ سلسلہ دراز رکھا اور دنیا میں یہ سلسلہ ہنوز کسی نہ کسی روپ میں جاری ہے۔ شاعر نے تاریخ کو اس المیے کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے ؎

یہ کیسا راہِ سیاست میں موڑ آیا ہے
جہاں یہ شہر بسا تھا وہیں پہ صحرا ہے
سکوتِ مرگ ہے اور ہڈیوں کا ڈھانچا ہے
قسم خدا کی یہ تاریخ کا المیہ ہے
ادیب و شاعر و نغمہ نگار قتل ہوئے
نقیبِ امن، رسولِ بہار قتل ہوئے

لیکن ان تمام خون خرابوں کے باوجود شاعر اس امید پہ زندہ ہے کہ یہ سلسلہ ایک دن ضرور ٹوٹے گا اور دنیا میں اسلحوں کی ہوڑ روک کر امن وامان کی بات شروع ہوگی۔ شاعر چوں کہ عالمی سطح پر امن وآشتی کا خواہاں ہے؛ اس لیے اس کا یہ جذبۂ صادق اس کی نظموں میں اجاگر ہو کر بار بار سامنے آتا ہے۔ وہ ہمہ وقت دعا گو ہے کہ آنے والا دن خوشگوار ہو اور دنیا میں دشمنی اور بغض ونفرت کی جگہ دوستی اور بھائی چارہ کا راج ہو۔ اس نظم کے آخری بند میں اسی خواہش کا اظہار ہے:

جسے سنبھال کے لایا ہے وقت کا آغوش
دعا یہ ہے کہ نیا سال سوگوار نہ ہو

یہ ساتھ لے کے چلے رنگ و نور کا تحفہ
خدا کرے یہ کبھی دشمنِ بہار نہ ہو
بنے سفیر یہ قوموں میں دوستی کے لیے
یہ چارہ ساز ہو بیمار زندگی کے لیے

رمزؔ عظیم آبادی نے اس نظم کے ذریعے پوری دنیا کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ انسانیت کی بقا اور انسانی زندگیوں کی سلامتی صرف اور صرف دوستی اور محبت میں مضمر ہے۔

نظم ''فطرت آزر'' میں بھی رمزؔ نے عالمی دہشت گردی کی نقاب کشائی کی ہے۔ شاعر نے اس نظم میں جس عالمی دہشت گرد کا ذکر کیا ہے، وہ ماضی میں بھی دنیا کے لیے خطرہ تھا اور آج بھی اس کی وجہ سے دنیا میں انتشار وخلفشار کا بازار گرم ہے۔ شاعر نے اس نظم میں اس جابر وغاصب ملک کا نام نہیں لیا ہے؛ لیکن اشارہ بہت واضح ہے۔ نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

دستِ سفاک میں مریم بھی ہے نشتر بھی ہے
خارِ نفرت بھی، محبت کا گلِ تر بھی ہے
پرچم امن بھی ہے، جنگ کا منظر بھی ہے
شاخِ زیتون بھی ہے، شعلۂ جوہر بھی ہے
ایشیا والوں کو حیرت ہے اسے کیا کہیے
دستِ قاتل اسے کہیے کہ مسیحا کہیے

رمزؔ نے اس غاصب کی چالبازیوں کو اجاگر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ ایک طرف امن کی دہائی بھی دیتا ہے اور دوسری طرف دنیا کو جنگ کے شعلوں کی نذر بھی کرنا چاہتا ہے۔ ایک طرف وہ زخم بھی دیتا ہے اور دوسری طرف مرہم بھی لگاتا ہے۔ اس کی اس پالیسی کو دیکھ کر ایشیا والے حیرت میں ہیں کہ آخر اسے کس نام سے پکارا جائے؟

مسدس میں کہی گئی اس نظم کے اگلے بندوں میں شاعر نے اس کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس نے دنیا کے ہر خطے میں اپنا سازشی جال بچھا رکھا ہے۔ اس نے لبنانؔ کی سرزمین کو آگ کے حوالے کیا، اس نے شاہ فیصل کو نشانہ بنایا؛ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمدردی بھی جتاتا رہا۔ اس نے کوریاؔ، ویتنامؔ، فلسطینؔ اور پورے مشرق وسطی پر مظالم کے پہاڑ توڑے اور انسانیت کو شرمسار کیا۔ اس نے دنیا کو رنگ ونسل میں بانٹا، نفرت وعناد کا زہر بویا، ایٹمی اسلحوں سے دنیا کو دہلایا

اوراس کی اس تباہ کاریوں میں ساتھ دینے والے ممالک بھی اس کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے رہے، یہاں تک کہ یو. این. او (U.N.O) جیسا عالمی امن وآشتی کا ادارہ بھی اس کے اشاروں پر ناچنے لگا۔ اس نے ہیروشیما کو راکھ میں ملا دیا، اس نے ایرانؔ کو زخم دیا، پھر بھی پوری دنیا خاموش رہی، شاعر کو اس بات پر حیرت ہے کہ اس قدر ظلم و دہشت گردی کو انجام دینے والا انسانیت کے وقار کو مجروح کرنے والا جاپان کے لاکھوں معصوموں کی جان لینے والا کب کیفر کردار کو پہنچے گا۔ ان احساسات کو ظاہر کرتا ہوا نظم کا آخری بند دیکھیں ؎

اس کے کردار سے مجروح ہے انساں کا وقار
چھین کر تخت عطا کرتا ہے، وہ تختۂ دار
صبح کے نور کا دشمن ہے رفیقِ شب تار
''ہیروشیما'' پہ ہے چھایا ہوا ایٹم کا غبار
مندمل ہو نہ سکا سینۂ جاپاںؔ کا زخم
ایک رِستا ہوا ناسور ہے ایران کا زخم

رمزؔ کی حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ایک نظم ''پاسدارانِ وطن'' بھی ہے۔ شاعر کے متعلق یہ پہلے ہی واضح کیا گیا ہے کہ اس کا سینہ وطن کی محبت سے معمور ہے اور وہ ہر حال میں اپنے وطنِ عزیز کو پھلتا پھولتا ہوا دیکھنے کا متمنی ہے۔ یہ نظم تحریک آزادیٔ ہند اور آزادی کے متوالوں کے نام ہے۔ یہ بند ملاحظہ کریں:

کارواں آگے بڑھا، گرد اڑی شور ہوا
راہ دشوار تھی سامانِ سفر کچھ بھی نہ تھا
کانٹے چبھتے رہے، چلتے رہے آبلہ پا
پاسدارانِ وطن پیکر ایثار و وفا
کج کلاہانِ جنوں دار و رسن تک پہنچے
زرد موسم سے یہ گزرے تو چمن تک پہنچے

شاعر کے مطابق ہر ہندوستانی غلامی کی زنجیروں سے آزادی چاہتا تھا اور اس کے لیے اس نے سر پر کفن باندھا اور فرنگیوں کے خلاف میدان میں کود پڑا۔ فرنگیوں نے جذبہ حریت کو کچلنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود تحریک زور پکڑتی گئی۔ مجاہدین نے زنداں میں بھی رہ کر آزادی کے

ترانے گائے۔ انھیں سولی تک لے جایا گیا تو ہنستے ہنستے وطن عزیز کی خاطر جان نچھاور کر دی۔ فرنگیوں کے آگے بھگت سنگھ، اشفاق اللہ، پیر علی، آزاد اور کنور سنگھ جیسے ملک کے سپوتوں نے سر نہیں جھکایا اور وطن کا گیت گاتے گاتے پھانسی کے پھندے پر جھول گئے اور آخر ایک دن یہ قربانیاں کام آئیں اور وطن آزاد ہو گیا۔ لیکن آزادی کے بعد کا منظر رمزؔ کو خون کے آنسو رلا گیا۔ ملاحظہ کریں یہ بند:

جاگا طوفان تشدد میں نہرو کا فسوں
سر بکف ہوگیا آزاد کا فرد دار جنوں
حرّیت آئی ہوا چہرۂ نہرو گلگوں
تلخ ہوتی ہے مری بات کہوں یا نہ کہوں
اپنی آزادی کے ہیں دشمن یہ بھارت کے عوام
جانے کس منہ سے یہ کرتے ہیں شہیدوں کو سلام

رمزؔ کے مطابق آزادی ملنے کی خوشی بے پناہ رنجشوں اور صدموں میں بدل گئیں، ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ مذہب کے نام پر نفرت اور تشدد اس قدر بھڑکا کہ ہزاروں ہندوستانی اس کی خوراک بن گئے۔ شاعر نے اس نظم کے آخری مصرعوں میں بہت تلخ؛ لیکن بہت سچی بات کہنے کی جرأت کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی آزادی کے دشمن خود ہندوستانی عوام ہیں، جنھوں نے اپنے شہیدانِ وطن کو فراموش کرتے ہوئے ان کی قربانیوں کو ضائع کیا ہے؛ اس لیے انھیں کوئی حق نہیں کہ وہ اپنے شہیدوں کے نام زبان پر لائیں۔ رمزؔ کی یہ نظم روایتی انداز میں شروع ہوتی ہے؛ لیکن اخیر میں گریز کے ذریعے جس طرح شاعر نے حصولِ آزادی کے بعد کے سانحات کا ذکر کیا ہے، وہ اپنے آپ میں اپنی مثال ہے اور اسی کے سبب اس نظم کی اہمیت میں حد درجہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

رمزؔ کی نظموں کی بڑی خصوصیات ہیں کہ ان کے یہاں ابہام، اغلاق اور غیر ضروری علائم و رمز و استعارے نہیں ہیں۔ زیادہ تر انداز براہِ راست اور اسلوب پُرکشش اور رواں ہے۔ ان کے یہاں اقبال کی طرح قوم کو بیدار کرنے کا جذبہ نظر آتا ہے؛ لیکن اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے اقبال کے انداز و اسلوب کو نہیں اپنایا، اپنے موقف کے اظہار کے لیے ان کے پاس اپنا پیمانہ، اپنا سانچہ ہے۔

رمزؔ کے یہاں خواہ وہ نظمیں ہوں، غزلیں ہوں یا قطعات و رباعیات، ہر جگہ شدومد کے ساتھ فرقہ وارانہ ذہنیت اور نفرت و عصبیت کے خلاف مضبوط آواز سنائی دیتی ہے؛ کیوں کہ رمزؔ کو اس بات کا احساس ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات میں مرنے والوں کے پسماندگان کا کیا حال ہوتا ہے، جو

بچے کم عمری میں یتیم ہو جائیں، یا جو عورت جوانی میں ہی بیوہ ہو جائے، ان کے ساتھ دنیا کا سلوک اکثر غیر انسانی اور بے رحمانہ ہوتا ہے، چوں کہ رمزؔ نے اپنے بچپن کے کرب کو جھیلا ہے، ہر طرح کی دقتوں اور مشکلات سے گزرے ہیں؛ اس لیے وہ اس کرب کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔

''شاخِ زیتون'' کی آخری نظم ''فرقہ پرستوں سے'' ہے۔ یہ نظم ایک پیغام بھی ہے اور ایک زبردست انتباہ اور تازیانہ بھی ہے۔ یہاں نظم کا ہر بند توجہ کا طالب ہے، اس نظم کا ابتدائیہ ملاحظہ کریں:

وطن کا ذرہ ذرہ پوچھتا ہے
بتاؤ قاتلوں کس کا لہو ہے
یہ کس بچہ کا لاشہ جل رہا ہے
ہوا میں گوشت کے جلنے کی بو ہے

آگے کے بندوں میں رمزؔ فرقہ پرستوں اور قاتلوں سے بہت ہی واضح لفظوں میں کچھ سوالات کرتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ کیا تم نے جس نوجوان کو قتل کیا ہے؟ کیا اس کی رگوں میں ہندوستانی خون نہیں تھا؟ کیا اس کے آباء واجداد نے ملک کے لیے قربانیاں نہیں دی ہیں۔ تم نے عورتوں کو بیوہ کیا، ان کے بچوں کو ان سے چھینا، کیا یہ کرتے ہوئے تم حیوان ہو گئے تھے؟ تم نے ہزاروں رضیہ اور کستور با کو نذرِ آتش کر دیا، اگر وہ حیات رہتیں تو آگے چل کر وہ جھانسی کی رانی بھی بن سکتی تھیں۔ تم نے اپنی بہنوں کی عصمتیں لوٹی ہیں۔ ہر لڑکی ہندوستان کی بیٹی ہے، تم نے اپنی بیٹی کی عصمت کو تار تار کیا ہے، تم نے مریم اور رادھا کو شرمسار کیا ہے۔ رمزؔ فرقہ پرستوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تم ان وطن پرستوں سے نفرت کرتے ہو اور ان کی جان کے درپے ہو، جنھوں نے ہندوستان کو جنت نظیر بنایا اور ہندوستانیوں کے لیے وحدت کا گیت گا کر سب کو متحد کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔

بہادر شاہ ظفر، ٹیپو سلطان اور اشفاق اللہ وغیرہ نے اپنی جان نچھاور کر کے ہندوستانیوں کو یک جہتی اور آپسی یگانگت کی انمول مثال پیش کی، اسیرانِ مالٹا اور ہزاروں علما کی قربانیاں اس بات کی شاہد ہیں کہ اپنے وطن سے ان کو کس قدر پیار تھا۔

رمزؔ نے آگے کے تین بندوں میں فرقہ پرستوں کو سمجھانے اور انھیں اس ذہنیت سے باز رکھنے کی کوشش بھی کی ہے:

بتاؤ اے ہمارے سور ماؤ
چراغ آندھی میں کیوں جلتا نہیں ہے

چھری ہوتی ہے تیز اپنوں کی خاطر
مگر غیروں پہ بس چلتا نہیں ہے

ذرا سوچو یہ رشتہ ہے لہو کا
کہیں دنیا میں اپنا چھوٹتا ہے
یہ بات آخر سمجھتے کیوں نہیں ہو
کوئی خود اپنے گھر کو لوٹتا ہے

تمام اقوام عالم کی نظر میں
ہوئی رسوا تمھاری نیک نامی
پنپتی جاتی ہے فرقہ پرستی
مقدر ہوتی جاتی ہے غلامی

رمزؔ نے اس نظم کے ذریعے نہ صرف یہ کہ ان فرقہ پرستوں کو مسلمان کی حب الوطنی اور قربانی سے واقف کرانا چاہا ہے؛ بلکہ انھیں یہ بھی یاد کرانا چاہا ہے کہ اس منافرت کی آگ میں وہ بھی جلیں گے؛ یعنی اگر اس فرقہ پرستی کے غلیظ عفریت شہر شہر، گلی گلی گھومتے رہے تو یہ ملک جنت نظیر نہیں جہنم کدہ کہلائے گا؛ اس لیے وہ اس بات سے بہت فکر مند ہیں۔ اس نظم کے افادی پہلو کے ساتھ رمزؔ کی قادر الکلامی اور بندوں کی اثر آفرینی بھی کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔

پچھلے صفحات میں ہم نے رمزؔ کی چند نظموں کا ذکر کیا ہے اور وہ اس طرح کیا ہے کہ شاعر کا مزاج، اس کا نظریہ سامنے آ جائے ساتھ ہی اس کی فن کارانہ خصوصیات بھی اجاگر ہو جائیں۔ عین ممکن ہے کہ اس ذکر کے دوران کسی اہم نظم کا حوالہ نہ آیا ہو، یا مذکورہ نظموں کا تجزیہ اور احاطہ خاطر خواہ نہ ہوا ہو؛ لیکن راقم الحروف نے حق المقدور یہ کوشش کی ہے کہ رمزؔ کی نظموں کی اہم خصوصیات کو قارئین تک پہنچایا جائے۔ یہ کوشش کتنی کارگر ہے، یہ قارئین فیصلہ کریں گے۔

رمزؔ عظیم آبادی کی غزلیں

رمزؔ بنیادی طور پر نظموں کے شاعر ہیں؛ لیکن ان کی غزلیں بھی کم اہمیت کی حامل نہیں ہیں؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی غزلوں کے بغیر ان کا مطالعہ نامکمل اور ادھورا رہے گا تو یہ کچھ بیجا نہ ہوگا۔ رمزؔ کی غزلوں کے غائر مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے غزلیہ اشعار میں ان کی نجی کیفیات کی بہتر ترجمانی ہوئی ہے۔ سہل زبان میں موثر اور دیرپا اشعار کہنا بھی رمزؔ کی قادر الکلامی اور فن کارانہ عظمت کی دلیل ہے۔ رمزؔ کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ انھوں نے بہت ہی مفلوک الحال اور تنگ دستی میں زندگی گزاری؛ لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں ایک اعلیٰ معیار کی سطح ہے اور وہ اس سطح سے کبھی نیچے نہیں گرتے۔ باوجود تمام محرومیوں اور نارسائیوں کے ان کے یہاں خود اعتمادی اور خود داری کا وصف نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ حالات کے جبر کا شکار ہوتے ہیں، تکلیف کا اظہار کرتے ہیں، شکوہ کناں بھی ہوتے ہیں؛ لیکن ساتھ ہی اپنی روایات اور اپنے فن پر نازاں بھی ہیں۔

رمزؔ کے یہاں غزلوں کے موضوعات میں تنوع اور وسعت ہے۔ وہ زندگی کے ہر رنگ سے واقف ہیں اور کمال خوبی کے ساتھ تمام رنگوں کو ذاتی اور خارجی سطح پر ابھارنے میں حد درجہ کامیاب ہیں۔ رمزؔ کو قدرت نے غضب کا طبع موزوں عطا کیا تھا۔ ساتھ ان کی فکر کی وسعت، بلندی اور ذوق سلیم کا کرشمہ بھی تھا، جس نے انھیں اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ رمزؔ نے کئی اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا؛ لیکن کسی کے نقش قدم کی تقلید نہیں کی۔ انھوں نے اپنے موقف

کے اظہار کے لیے خود اپنی راہ ہموار کی؛ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ رمزؔ کے پاس جو کچھ تھا، ان کی کوششوں اور کاوشوں کے سبب تھا تو اس میں کوئی نامناسب بات نہیں ہوگی۔

اب آیئے ان کے پہلے شعری مجموعے ''نغمۂ سنگ'' یہ اشعار دیکھیں

ناتراشیدہ صنم خواب سے چونک اٹھے ہیں
سنگ ہے منتظر تیشۂ فرہاد اے دوست

❀

رمزؔ شکستہ آئینے کا ٹکرا اک چہرہ ہے
شیش محل کو توڑ کے دیکھو سینکڑوں گھر بن جائیں گے
آنے والی نسلیں ہم کو بھول سکیں ناممکن ہے
نقش قدم کے مٹتے مٹتے راہ گذر بن جائیں گے

ان اشعار کے متعلق رمزؔ کے ایک بہت ہی مقرب شاگرد اور معروف شاعر کیف عظیم آبادی نے خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں منعقدہ رمزؔ کے ساتھ ایک شام میں مباحثے کے دوران اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:

''رمزؔ عظیم آبادی کے اس طرح کے سینکڑوں ایسے عظیم اشعار ہیں، جو رمزؔ نے کہے، جن کو سنا گیا ہے؛ مگر ان پر کوئی کام نہیں کیا گیا ہے، یا کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ابھی تک یہ ہمارے بہار کے لیے بہت ہی افسوس ناک بات ہے اور یہ معاملہ خاص کر کے بہار میں زیادہ ہے اور انہی کے ساتھ نہیں بہت ایسے شاعر ہمارے گزرے ہیں اور ابھی ہیں جن پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی اور ان کو مشاعروں کا شاعر کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے۔ ''کبھی یہ چھپتے نہیں ہیں'' کچھ بھی کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے؛ مگر جو ان کی اہمیت ہے، ان کے اشعار کی جو قدر و قیمت ہے، اس کو آپ بھلا نہیں سکتے، نظر انداز نہیں کر سکتے، آج نہیں تو کل رمزؔ عظیم آبادی پر آپ کو توجہ کرنی ہوگی، آپ کو کام کرنا ہوگا اور نئی نسل کو آگے آنا ہوگا''۔

(''رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، ص: 80-81)

مندرجہ بالا تاثر سے تین باتیں واضح ہو کر آتی ہیں: پہلی یہ کہ رمزؔ عظیم آبادی کے یہاں عمدہ اشعار کا تناسب زیادہ ہے اور ان کے سینکڑوں اشعار ایسے ہیں، جنہیں ہم بہترین شاعری کے زمرے

میں رکھ سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ رمزؔ کی اس قدر عمدہ اور معیاری شاعری کی قدر نہیں ہوئی اور خاص طور سے بہار والے اپنے فنکاروں کی قدر نہیں کرتے ؛ بلکہ ان پر طرح طرح کی تہمتیں دھر کے انھیں کم تر دکھانے کی کوشش کرتے ہیں ؛ یعنی باہری فنکاروں کو یہاں سر پہ بیٹھایا جاتا ہے اور اپنے آرجنل فنکاروں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کیفؔ کے مطابق یہی کام رمزؔ کے ساتھ ہوا۔ تیسری بات یہ کہ آج رمزؔ پر بھلے ہی اتنی توجہ نہیں دی جارہی ہے ؛ لیکن آنے والے وقتوں میں ان کی اہمیت و عظمت کا اعتراف ہوگا اور ان کے شاعرانہ مقام و مرتبے کا تعین ہوگا۔

اس اقتباس میں کیفؔ صاحب نے زمرؔ کے اس کمزور پہلو کی طرف شاید قصداً اشارہ نہیں کیا ہے، جس کے سبب اس وقت کا ایلیٹ (Elite) طبقہ انھیں کم تر اور غیر تعلیم یافتہ تصور کرتا تھا؛ یعنی وہ مزدوری کرتے تھے، رکشہ چلاتے تھے؛ اس لیے بھی ان کے معاصرین اور خاص طور سے بہار کے نام نہاد اعلیٰ اور اشرافیہ طبقے نے انھیں ہمیشہ کم تر آنکنے کی کوشش کی۔ اوپر کے سطور میں بھی رمزؔ عظیم آبادی کی شام کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں رمزؔ کے ساتھ ہوئی ناانصافی کے متعلق معروف شاعر صدیق مجیبی مرحوم نے بھی کچھ ایسی ہی باتیں کہی ہیں، جیسی کہ ہم نے اوپر کے اقتباس میں پڑھیں: ملاحظہ کریں اس مذاکرے کا یہ قضیہ:

> ”ابھی مظہر امام صاحب، یا.... کسی نے کہا کہ جوان کو (رمزؔ کو) مقام ملنا چاہیے تھا، اس کی طرف نہ نقادوں کی نظر گئی، نہ ہمارا کوئی قصور ہے اور یہ بات بھی کہی کہ یہ ایسا کلام یہ رکشہ چلانے والا کیسے کہہ سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ جس طرف ہماری توجہ نہیں گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تصور تھا کہ اچھی شاعری اچھی زبان اور زبان دانی کا جو تعلق ہے، یہ تو اوپر کی سطح کے لوگوں کا ہے۔ ایلیٹ (Elite) کیرکٹر کے لوگوں کا ہے، یہ ہائی، اعلیٰ نسبی کا تھا۔ یہ رکشہ چلانے والا جو ہے، یہ اچھی شاعری کرنے، یا اچھی زبان لکھ کیسے سکتا ہے؟ اس تصور نے ان کو بہت دور رکھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ عوامی شاعر جیسا کہ کہا اور صحیح معنوں میں ایک عوامی شاعر یہی نہیں، وامقؔ جونپوری نے لکھا ہے کہ عوامی شاعر ہیں تو عوامی شاعر کی بدنصیبی یہ ہوتی ہے کہ آپ نے دیکھا کہ اتنا بڑا عوامی شاعر کی قسمت میں اس کے عہد میں شاید اُسے نہیں پہچانا جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ ابھی عہد کا مزاج بدلا نہیں ہے، جب یہ مزاج بدل جائے گا تو ہم سمجھیں گے کہ سورج کی

> روشنی ذرّے کو کہاں چمکا رہی ہے اور یہ کتنا تاباں ہے، کتنا معتبر ہے۔ دراصل اس تصور نے ایسے کتنے شاعروں کو قتل کیا ہے، کتنوں کو زندہ دفن کر دیا ہے اور کتنے شاعروں کو ان کا حق نہیں ملا ہے....“۔

(”رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن“۔ محمد شمس الحق، ص 84)

یعنی ایک طرف رمزؔ صاحب کو نظر انداز کرنے کا رویہ تھا اور دوسری طرف انھیں مشاعرے کا یا قوالوں کا شاعر کہہ کنارے لگانے کا بھی انتظام تھا، جس کا نقصان رمزؔ صاحب کو بہر حال اٹھانا پڑا۔ صوبائی یا ملکی سطح پر ادب کی بڑی شخصیات اور ناقدین نے ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ ان کی کوتاہیوں کا بھی اچھا خاصا دخل تھا۔ وہ بے نیازی میں بہت کچھ چھوڑتے گئے۔ رسالوں میں کلام کی اشاعت سے پرہیز کرتے رہے، رمزؔ صاحب اپنی کتاب ان اشخاص کو دیتے تھے، جنھیں ادب سے کوئی شغف نہ تھا؛ اس لیے دانشور اور ادب نواز طبقے تک وہ نہیں پہنچ سکے اور سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے بڑی تعداد میں اپنا کلام دوسروں کو دے دیا اور خود بہت حد تک خالی ہوگئے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ وہ حد درجہ زود گو شاعر تھے اور انھوں نے بڑی تعداد میں نظمیں اور غزلیں تخلیق کیں؛ لیکن ان کے پاس صرف اتنی ہی چیزیں ملیں، جو صرف دو مختصر کتابوں میں آ کر سمٹ گئیں تو پھر آخر ان کے بقیہ کلام کا کیا ہوا؟

خدابخش لائبریری، پٹنہ میں 31 جنوری 1992ء کو منعقد رمزؔ کے نام منسوب شام کے مذاکرے میں اس طرح کے سوالات پیش کیے گئے۔ مذاکرے کے اخیر میں ایک اہم سوال صفدر امام قادری کا یہ تھا کہ رمزؔ کے ہزاروں اشعار پر آج دوسروں کے مالکانہ اختیارات ہیں، اس کے متعلق ان کی کیا رائے ہے؟ فیاض الرحمٰن شارقؔ کا سوال یہ تھا کہ آپ (رمزؔ صاحب) نظموں کے شاعر ہیں؛ لیکن وہ کون سے محرکات تھے، جس نے آپ کو غزل گوئی کی طرف متوجہ کیا؟ ابوبکر رضوی نے صفدر امام قادری کے سوال سے اپنے سوال کو جوڑتے ہوئے پوچھا کہ دوسروں کو دس گنا کلام دینے کی کیا وجہ تھی؟.... لیکن ظاہر ہے رمزؔ صاحب اس کا کیا جواب دے سکتے تھے؟ وہ وقت کے مارے تھے، سیدھے اور سادہ لوح تھے۔ شاہی اور قلندری دونوں صفات کے مالک تھے، کبھی کسی سے کچھ لے لیا اور کبھی موڈ میں آیا تو یونہی سب کو فیض یاب کرتے چلے گئے اور یہ بھی نہ سوچا کہ آنے والے وقتوں میں ان کے پاس کیا بچ جائے گا؟ بہر حال رمزؔ کے ساتھ بھی یہ حالات پیش آئے اور جو بھی ان سے کوتاہیاں ہوئیں، اس کا نقصان ان کو کسی نہ کسی شکل میں اٹھانا پڑا؛ لیکن خوشی کی بات ہے کہ رمزؔ اپنے بچے کھچے کلام کے ساتھ آج بھی زندہ ہیں۔

آج رمزؔ کی تصنیفات کے نام پر ان کی دو کتابیں ''نغمۂ سنگ'' اور ''شاخ زیتون'' موجود ہیں۔ ان کتابوں کے متعلق گزشتہ سطور میں بھی عرض کیا گیا ہے کہ دونوں کی ابتدا میں نظمیں ہیں اور اخیر میں غزلیں ہیں۔ ''نغمۂ سنگ'' میں نظمیں زیادہ ہیں تو ''شاخِ زیتون'' میں کم۔ یہی معاملہ کم وبیش غزلوں کا بھی ہے۔

رمزؔ کے یہاں آج جو بھی شعری سرمایہ موجود ہے، وہ شمار میں تو ضرور کم ہے؛ لیکن اپنے معیار اور اپنی مقبولیت کے اعتبار سے بہت زیادہ ہے، یہاں بات ہو رہی تھی ان کی غزلیہ شاعری کی تو اس سلسلے میں بہتیرے اہالیانِ ادب نے ان کی نظم نگاری کی طرح ان کی غزل گوئی کو بھی اہمیت دی ہے۔ بعض اہل علم کے مطابق وہ نظمیہ اور غزلیہ دونوں طرح کی شاعری پر مساوی دسترس اور قدرت رکھتے تھے۔ نیز یہ بھی سامنے آیا کہ رمزؔ نے اپنی زیادہ تر نظموں میں خارجی دنیا کے سفید وسیاہ کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے، جب کہ ان کی ذات اور ان کے نجی احساسات ان کی غزلوں میں ہی بہتر طور پر ظاہر ہوئے ہیں۔

اب آیئے ان کے کچھ اشعار دیکھیں۔ یہ ''نغمۂ سنگ'' سے لیے گئے ہیں۔

جانے کیوں اب دوستوں سے مشورہ لیتا نہیں
لا اُبالی تھا مگر اتنا کبھی خود سر نہ تھا

❁

حدتِ فن نے مجھے ضو دی ہے، میں تابندہ ہوں
آج دنیا کچھ کہے میں شاعر آئندہ ہوں
اے زمیں تو بھی سمجھتی ہے مجھے کیوں اجنبی
کیا میں کوئی دوسرے سیارے کا باشندہ ہوں

❁

اکیلا ہی میں غم گزیدہ نہ تھا
بدن دوستوں کا بھی نیلا ملا

❁

پتھر پہ ابھرتا ہے وہی نقش کی صورت
جو گیت زمانہ کبھی گانے نہیں دیتا

❁

اٹھا کے اپنے عقائد کی سیڑھیاں لے جا
مجھے زمین پہ کوثر تلاش کرنے دے

❁

خبر یہ ہے کہ کھلے ہیں گلاب صحرا میں
رسولِ فصلِ بہاراں برہنہ پا ہوگا
سب اپنے دائرہ فکر میں مقید ہیں
ہر ایک شخص کوئی بات سوچتا ہوگا

❁

وقت بھی جیسے میرے گھر سے آگے جانا بھول گیا
کمرے میں ہے گھپ اندھیرا، باہر ہے طوفانی رات

❁

کتنی سوندھی ہے مٹی ترے گاؤں کی، بھول جا یاد رکھنے سے کیا فائدہ
بے وطن کا سہارا ہے یہ میکدہ، محویت چھوڑ دے جام بھر اجنبی

یہاں جو اشعار نقل کئے گئے ہیں، وہ ان کے مقبول اشعار نہیں ہیں اور انھیں حوالے کے طور پر بھی اکثر پیش نہیں کیا جاتا؛ لیکن بظاہر سادہ اور سہل دکھنے والے یہ اشعار اپنے اندر فنی اور معنوی دونوں سطحوں پر تہہ داری رکھتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ رمزؔ کے نجی تجربے اور ان کے ذاتی کرب کے آئینے ہیں۔ ابھی یہ بات سامنے آئی ہے کہ رمزؔ کے ذاتی جذبات واحساسات ان کی غزلوں کے اشعار میں زیادہ موثر طریقے سے ظاہر ہوئے ہیں تو اس بات کی تصدیق کے طور پر پہلا شعر ہی ملاحظہ کریں۔ اس شعر کی تہہ میں اترنے پر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اب ان تمام لوگوں سے بدظن اور بدگمان ہو گیا ہے، جو کبھی اس کے بہت ہی مقرب اور عزیز تھے۔ ان کے مشورے مشعلِ راہ ہوا کرتے تھے اور ان سے روگردانی کرنا محال تھا؛ لیکن وقت اور حالات نے رفتہ رفتہ یہ شاعر کو بتا دیا کہ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے سب کچھ دھوکہ ہے، پھسلاوا ہے؛ اس لیے کنارہ کشی لازمی ہے۔ دوسرے شعر میں شاعر نے حقیقت سے کام لیتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ جب تک فنکار کے اندر آگ موجود ہوتی ہے، تب تک اس کا سفر جاری

رہتا ہے اور وہ نئے نئے مرحلوں سے گزرتا رہتا ہے؛ لیکن جب فنکار کے اندرون کی حدت اور شعلگی ماند پڑ جاتی ہے تو وہ دھیرے دھیرے موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے اور اس کا فن موت کی آغوش میں جا کر ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جاتا ہے، یہاں رمزؔ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے یہاں فن کی حدّت نے انھیں روشنی دے کر زندہ رکھا ہے اور یہ روشنی کم ہونے کے بجائے دن بہ دن اور ضوفشاں ہو رہی ہے؛ اس لیے وہ آنے والے وقتوں میں بھی اس طرح قائم اور مستحکم رہیں گے اور آنے والی نسلیں انھیں مینارۂ نو تصور کر کے ان کی قریب تر آئیں گی اور ان کی روشنی سے اپنے ذہن و قلب کو منور کریں گی۔

تیسرے شعر میں شاعر کا نجی کرب ظاہر ہو کر سامنے آیا ہے۔ دنیا اسے بیگانہ اور اطراف کے لوگ اس سے اجنبی کی طرح سلوک کرتے ہیں۔ اس بے رخی اور بے مروتی کا سبب یہ ہے کہ شاعر کم مایہ ہوتے ہوئے بھی خود سر ہے اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ یہاں شاعر نے خود کو دوسرے سیارے کا باشندہ کہہ کر نہ صرف یہ کہ لفظی سطح پر جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؛ بلکہ خود کو سب سے الگ اور منفرد بھی باور کرانے کا جتن کیا ہے۔ یہاں بھی تعلی ہے؛ لیکن نہایت ہی خفی طور پر۔ چوتھے اور پانچویں شعر میں زمانے سے شکوہ ہے؛ لیکن یہ شکوہ کچھ اس طرح ہے کہ اس سے حوصلہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اور عزم محکم بھی؛ یعنی زمانہ لاکھ کسی کو ستائے، نظر انداز کرے؛ مگر وہ ایک دن تابندہ سورج کی طرح پورے عالم پر محیط ہو جاتا ہے، بشرطیکہ اس کے اندر حرارت ہو، شدت ہو اور جذبے کی صداقت ہو۔ یہاں شاعر نے یہ بھی توضیح کرنے کی کوشش کی ہے کہ صرف زمانے میں وہی مردم گزیدہ نہیں ہے؛ بلکہ اس طرح کی کچھ اور بھی ہیں، جن کے نقش کو وقت کے ظالم ہاتھوں نے مٹانے کی کوشش کی ہے۔

''نغمۂ سنگ'' کا شاعر خوابوں کی حسیں وادیوں میں تخیل کے سہارے زندہ رہنے والا فنکار نہیں ہے؛ بلکہ وہ حقیقت کی ٹھوس زمین پر رہتا ہے اور تلخ حقائق سے ہمہ وقت نبرد آزما ہوتا ہے؛ اس لیے اپنے جہد مسلسل اور جگر کاوی سے اسی زمین پر اپنی فصلیں اگاتا ہے، جس پر وہ ہر لمحہ سانسیں لیتا ہے۔ آگے کے چار اشعار میں کہیں انسان کے کرب ذات کا ذکر ہے تو کہیں اس کے اندرون کے احساسات کا المیہ ہے۔ کہیں اس کی بامرادی اور بدنصیبی کا اظہار ہے تو کہیں دنیا سے سمجھوتا کر کے ہر حال میں خوش رہنے اور زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ اس تفصیل کے قبل عرض کیا گیا کہ یہ رمزؔ کے نمائندہ اشعار نہیں ہیں؛ لیکن ان میں رمزؔ کی ذات اور خالص ان کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہوئی ہے؛ اس لیے یہ خاص اہمیت کے حامل اشعار ہیں۔

رمزؔ نے چوں کہ بہت سخت اور آزمائش بھری زندگی گزاری؛ اس لیے ان کے یہاں اکثر خفگی

اور درشتگی کے عناصر صاف طور پر جھلکتے ہیں؛ لیکن وہ اپنی محرومیوں اور نارسائیوں کے باوجود فن کی حرمت اور زبان کی پاکیزگی کو قائم رکھنے میں کامیاب ہیں۔ وہ بہ یک وقت روایتی شاعری سے بھی مستفید ہوتے ہیں اور فکر کی جدت کے بھی تجربے کرتے رہتے ہیں۔

رمزؔ صاحب کی مذکورہ خصوصیات کا اعتراف کرتے ہوئے اردو کے سرکردہ ناقد اور ادیب پروفیسر اعجاز علی ارشد نے لکھا ہے کہ:

''.... فرقہ پرستوں کی مخالفت، جنگ سے نفرت، روشن خیالی، امن پسندی، انسانیت سے پیار، عظمتِ انسانی پر اصرار، سرمایہ دارانہ طاقتوں سے بیزاری ان فنکاروں کی حرمت کا احساس، ان کی نظموں کے بنیادی فکری عناصر ہیں۔ ان میں سے بیشتر پہلو ان کی غزلوں میں بھی فنی رکھ رکھاؤ کے ساتھ پیش ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے فن کی ناقدری اور زندگی کی سخت کوشی بھی انھیں اکثر مضطرب رکھتی ہے، جس کے سبب ان کی بیشتر غزلوں میں ایک نہ ایک شعر ایسا دکھائی دیتا ہے، جس میں اپنی محرومیوں کا شکوہ کیا گیا ہے۔ بہر حال شاعر کے بالیدہ شعری ذوق اور کلاسکی شاعری کے گہرے مطالعے کے سبب یہ اشعار بھی صرف حرفِ شکایت نہیں رہتے؛ بلکہ اثر انگیز حرفِ سخن بن جاتے ہیں.....

رمزؔ کی بعض غزلوں میں عصر حاضر کی پیچیدہ زندگی اور انسانی نفسیات کے بدلتے ہوئے تیوروں کا بھی منظر ملتا ہے؛ مگر یہ منظر سپاٹ یا مبہم بیانات پر مبنی نہیں ہے بلکہ رمزؔ نے غزل گوئی کے فن پر اپنی بہترین گرفت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے ذاتی تجربوں کے پیکر میں عصری صداقتوں کو پیش کیا ہے.....''۔

(''شاخ زیتون''، حرفے چند، اعجاز علی ارشد، ص:26-25)

درج بالا اقتباس میں پروفیسر اعجاز علی ارشد نے رمزؔ عظیم آبادی کی شاعری کی روح کو پکڑنے کی کوشش کی ہے۔ نیز ان کے موضوعات، شاعری کی محرکات اور ان کے فن پر گرفت کی بابت بہت مختصر؛ لیکن جامع تبصرہ کیا ہے۔ رمزؔ کے متعلق گزشتہ سطور میں بھی یہ عرض کیا گیا ہے، جو موضوعات ان کی نظموں کے ہیں، تقریباً وہی موضوعات غزلوں میں بھی بہ انداز دگر دیکھنے کو مل جاتے ہیں؛ مگر ایک فرق کے ساتھ اور وہ فرق یہ ہے کہ رمزؔ نے اپنی غزلوں کے ذریعے اپنے داخلی کیفیات اور احساسات کو زیادہ موثر طریقے سے پیش کیا ہے۔ اب آیئے اشعار اور دیکھیں۔ یہ اشعار بھی ''نغمۂ سنگ'' سے ماخوذ ہیں اور یہ بھی رمزؔ کے نمائندہ اشعار نہیں ہیں؛ مگر ان کے مزاج و منہاج اور فکر و آگہی کی تفہیم میں حد درجہ معاون ہیں:

حادثوں سے ڈرنے والو ہے یہ میرا مشورہ
دائرے میں خود کو مرکز مان کر گھوما کرو

❁

یہ کس مقام پہ چھوڑا ہے وقت نے لاکر
نہ زندگی کی تمنا، نہ زندگی سے فرار

❁

یہ کسی موسم کا بھی محتاج ہوسکتا نہیں
پیڑ جو بنجر زمیں میں پھولتا پھلتا رہا
رمؔز میری ہر غزل ہے زندگی کا آئینہ
شعر کے سانچے میں اک اک سانحہ ڈھلتا رہا

❁

ذہن میں پیوست ہیں کتنے ہی حرفِ بے سند
شہر کا ماحول سنجیدہ ہے دشناموں کے بعد

❁

رمؔز بغاوت کے گیتوں کی جب آواز بھی اٹھتی ہے
لفظوں میں شعلوں کی لپٹ ہے لہجہ بھی جھنکار کرے

❁

اپنے شعروں کو تو اپنے شہر کی گلیوں میں پھینک
جو انھیں موتی سمجھ لے گا، اٹھا لے جائے گا

❁

نسلوں کو میرا نقشِ قدم خود بتائے گا
چلنے کا حوصلہ مری پسپائیوں میں تھا

❁

کب شمع کی لو پر گرتا ہے، الزام نہ دو دیوانے کو
یہ لیلیٰ شب کا عاشق ہے، پرکھو تو کبھی دیوانے کو

❁

ساقی کی نشیلی آنکھوں کا یہ طنز ہے پینے والوں پر
ہے کون جو ہنس کر پی جائے اس زہر بھرے پیمانے کو

درج بالا اشعار رمؔز کی الگ الگ کیفیات کے غماز ہیں؛ لیکن ایک مخصوص فکر اور خاص دائرہ ہے، جس کے اندر یہ اشعار ترسیل کے مرحلے طے کرتے ہیں۔ یہ بات قبل میں بھی عرض کی جاچکی ہے کہ رمؔز کے یہاں علامت اور استعارے کی دبیز تہیں نہیں ہیں، جو کچھ ہے صاف اور بالکل واضح ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ رمؔز جس مزاج اور فکر کے شاعر تھے، اس کے لیے یہی لب ولہجہ اور اسلوب مناسب تھا۔ اہالیانِ ادب واقف ہیں کہ رمؔز جدیدیت کے زمانے میں بھی خوب اشعار کہہ رہے تھے، ان کے گرد و پیش میں جدید شعرا کے مبہم اشعار بھی کثرت سے موجود تھے۔ ادبی ماحول پر جدت کا رنگ چڑھ رہا تھا؛ لیکن اس آپادھاپی کے دور میں بھی رمؔز نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا اور اپنی پرانی ڈگر پر مضبوطی سے قائم رہے۔

رمز کے یہ اشعار جیسا کہ کہا گیا کہ مختلف کیفیات کا آئینہ ہیں؛ لیکن مرکزی فکر تقریباً ایک ہی ہے۔ شاعر کے مطابق جو لوگ حادثوں سے خائف ہو کر منظر سے پس منظر کی طرف جانے لگتے ہیں اور حد درجہ مایوسی اور کلبیت کا شکار ہو جاتے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ ہر حال میں حوصلہ اور ہمت کا دامن نہ چھوڑیں اور خود اپنے آپ کو مرکز مان کر، اپنی ذات کو محور مان کر اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ دوسرے شعر میں اس بات کی توسیع کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ ہماری زندگی اکثر ہمارا امتحان لیتی ہے، کبھی کبھی ایسی صورتحال بھی پیدا ہوتی ہے کہ انسان نہ جی سکتا ہے اور نہ مر سکتا ہے، اس حالت میں صحیح فیصلہ لے کر کامیاب ہونے میں ہمارا حوصلہ اور عزم محکم بہت ہی معاون ثابت ہوتا ہے۔ اگلے دو اشعار میں شاعر اپنے بلند حوصلے کا ذکر کرتے ہوئے یہ دعوی کرتا ہے کہ حالات خواہ جیسے بھی ہوں، ہمیں آگے بڑھنا ہے اور منزل مقصود کو حاصل کر کے ہی دم لینا ہے۔ شاعر کے مطابق اس کے اشعار ایسی ہی جد وجہد اور کوشش پیہم کا نتیجہ ہیں؛ اس لیے یہ صحیح معنوں میں زندگی کا آئینہ ہیں۔ آگے کے اشعار میں شاعر جہاں بغاوت کے گیتوں کی بات کرتا ہے تو وہیں شہر کے مزاج اور لوگوں کے رویے کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ وہ اپنی خدمات کے عوض ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کا موقف یہ ہے کہ جو قدرداں ہیں، وہ اس کی قیمت اور اہمیت سمجھیں گے اور انھیں اپنے ذہن ودل میں محفوظ رکھیں گے۔

قبل میں عرض کیا گیا کہ رمزؔ کے غزلیہ اشعار میں ان کی ذات واضح طور پر نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے۔ آٹھویں شعر میں رمزؔ نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ انکی نارسائیاں اور نامرادیاں انھیں پسپا نہیں کرتیں؛ بلکہ حوصلہ عطا کرتی ہیں؛ اس لیے آنے والی نسلیں انھیں ایک مینارۂ نور تصور کر کے ان سے ضو حاصل کریں گی اور زندگی کا سفر بہ آسانی طے کریں گی۔ نویں شعر میں شاعر نے اردو کی شعری روایت سے ہٹ کر ایک بالکل الگ طرح کی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مطابق پروانہ شمع کی لو پر گر کر جان نہیں گنواتا؛ بلکہ وہ تو رات کی تاریکی کو پسند کرتا ہے؛ یعنی اصل میں وہ لیلیٰ شب کا عاشق ہے؛ لیکن دنیا اسے پروانے کا عاشق سمجھتی ہے۔ اس سلسلے کے آخری شعر میں شاعر نے ایک ایسی کیفیت کا اظہار کیا ہے، جس سے وہ ہر دم گزرتا رہا ہے؛ یعنی زمانہ اسے ستاتا رہا، اسے کم تر اور حقیر سمجھتا رہا ہے۔ ساتھ ہی اس کے سامنے طرح طرح کی رُکاوٹیں بھی کھڑی کرتا رہا؛ تاکہ وہ پست ہمتی کا شکار ہو کر شکست مان لے؛ لیکن اس نے کسی طور بھی ہار نہیں مانی اور ہر مشکل مرحلے کو بہ وقت تمام سر کر کے ہی دم لیا۔

''نغمۂ سنگ'' میں ان کے علاوہ بھی عمدہ اشعار موجود ہیں۔ بعض غزلیں بہت طویل ہیں اور بعض مختصر؛ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ ان میں بھرتی کے اشعار بہت کم ہیں؛ یعنی جو ہیں، وہ منتخب ہیں اور ہر شعر رمزؔ کی شخصیت اور ان کے گرد و پیش کو پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ رمزؔ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تلخ اور سخت باتیں بھی کرتے ہیں تو شعری تقاضوں کے التزام کے ساتھ؛ یعنی وہ فن کے تقاضے کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری فنی اور موضوعاتی دونوں سطحوں پر حد درجہ پرکشش اور اثر انگیز ثابت ہوتی ہے۔

نظموں کے حوالے سے ''شاخِ زیتون'' کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب یہاں ''شاخِ زیتون'' میں شامل رمزؔ کی غزلوں کی بابت کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔ اس مجموعے کا آغاز ان کی جس غزل سے ہوتا ہے، اس کے تین اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مری زبان کی عبادت ہے گفتگو تیری
مرے فسانے کا عنواں ہے آرزو تیری

❀

فریبِ نکہتِ گل سے بچا کے دامنِ دل
زبانِ خار سے سنتا ہوں گفتگو تیری

❀

غرض ہے دیر سے مجھ کو، نہ فکر کعبہ سے
میں اپنے آپ میں کرتا ہوں جستجو تیری

اس غزل کو دبستانِ عظیم آباد کے مرتب اور معروف ادیب احمد تبسم نے اسے رمزؔ کے ابتدائی دور کی تخلیق بتایا ہے۔ بہرحال ان اشعار کو پڑھنے سے ایک بات صاف ہے کہ ان میں روایتی شعری محاسن کا بطور خاص استعمال کیا گیا ہے۔ ان تینوں اشعار میں بھی رمزؔ کے مزاج و منہاج کا عکس صاف جھلکتا ہے۔ رمزؔ کی خود داری، خود پسندی اور اپنے خیال کی صداقت کی دلیل بھی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ یہاں بھی رمزؔ کی ذات کا کرب اور محرومی صاف ظاہر ہے؛ یعنی رمزؔ نے جس انداز میں اپنی غزلیہ شاعری کا آغاز کیا، وہ انداز اخیر تک قائم رہا۔ ہاں! اس میں اتنا اضافہ ضرور ہوا کہ موضوعات کی وسعت بڑھی۔ لب و لہجے میں مزید دھار پیدا ہوئی اور رومانی اشعار (جو کہ پہلے ہی کم تھے) کی تخلیق میں مزید کمی آئی۔ اب آیئے رمزؔ کی اسی غزل سے یہ رومانی اشعار بھی دیکھ لیں:

حجاب میں بھی تجھے بے حجاب دیکھ لیا
ہر ایک پھول میں چہرا ترا ہے، بو تیری

❀

رہا نہ پردہ سلامت جمال پردہ نشیں
گلوں نے کھینچ لی تصویر ہو بہو تیری
جو دیکھا رمزؔ کی آنکھوں میں بعد مرنے کے
کھنچی تھی پتلی میں تصویر بہو تیری

یہ اشعار گرچہ رومانی لگتے ہیں؛ لیکن انھیں عشقِ حقیقی کے زمرے میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ ایک بات یہاں غور طلب ہے کہ رمزؔ صاحب عشقیہ اشعار بھی خوب کہتے ہیں۔ اگر وہ اس نوع کے اشعار کہتے تو بلا شک وشبہ اس میدان میں بھی وہ اپنے معاصرین میں نمایاں ہوتے؛ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا کہ انھیں عشقیہ اور رومانی شاعری سے کچھ رغبت نہیں تھی۔ ان کے اندر زمانے کی کڑواہٹ اتنی تھی کہ اسے ہی شعری قالب دینے میں ہمہ وقت مصروف رہے۔

رمزؔ عظیم آبادی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے مشاہیر نے طرح طرح کے تاثرات کا

اظہار کیا ہے۔ کسی نے ان کے اشعار پڑھ کر اشتراکیت کا سراغ لگایا تو کسی نے جدیدیت کا اور کسی نے ان تمام تحریکات ورجحانات وتحریکات کا جزوی، یا خارجی اثر تو ضرور لیا؛ لیکن بعد میں انھوں نے اپنے لیے خود اپنی راہ پیدا کی۔ یہ ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ وہ پرویز شاہدی کی صحبت میں اشتراکیت کے قریب ہوئے تھے؛ لیکن وہ بہت دنوں تک اس پر قائم نہ رہ سکے۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ وہ سماج کے دبے کچلے طبقے، مزدوروں اور محنت کشوں کی حمایت میں ضرور لکھتے رہے۔ اب ان کی غزلیہ شاعری کے متعلق چند مشاہیر کے تاثرات ملاحظہ کریں:

''....رمزؔ کی شعر گوئی کا آغاز اس وقت ہوا جب ترقی پسند شاعری کا شباب تھا، اس نئے اندازِ شاعری سے وہ متاثر ضرور ہوئے؛ لیکن ترقی پسند شاعروں کے ہجوم میں انھوں نے اپنی الگ شناخت بنائی، ان کی شاعری میں عصری آگہی اور گرد وپیش کے مسائل سے واقفیت کے علاوہ کلاسکی شاعری کی شائستگی بھی ہے اور لفظوں کا رکھ رکھاؤ بھی۔ ندرتِ تخیل بھی ہے اور ندرتِ اظہار بھی۔ استعاروں کا حق بھی ہے اور تشبیہوں کی دل کشی بھی۔ انھیں خوبیوں نے رمزؔ کو دنیائے شاعری میں انفرادیت بخشی۔ 1960ء کے لگ بھگ جدیدیت کے شور شرابے کا آغاز ہوا، جس کی بالغ نظری نے اس شور شرابے کو ایک موج زود گزر سے زیادہ اہمیت نہ دی اور ان کی سلامت روی نے دستارِ فضیلت کو اخیر عمر تک سنبھالے رکھا''۔

(''شاخِ زیتون''۔ بہزاد فاطمی ص:18)

''کلکتہ کے قیام کے دوران انھوں نے پرویز شاہدی سے مشورۂ سخن کیا، یہیں وہ ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوئے اور ان کی شاعری میں اشتراکیت کے عنصر پائے جانے لگے؛ لیکن ان کا یہ رنگ انتہائی عارضی تھا اور اسے انھوں نے بہت جلد ترک کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ کسی ''ازم'' سے کبھی بھی وابستہ نہیں رہے....''۔

(''شاخِ زیتون''۔ ہارون رشید ص:24)

''رمزؔ عظیم آبادی بنیادی طور پر ترقی پسند فکر کے مالک ہیں؛ مگر اکثر ترقی پسند شاعروں کے یہاں جو پرشور احتجاج ملتا ہے، اس سے رمزؔ نے دامن بچایا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ترقی پسند فکر کو فنی آراستگی کے ساتھ اپنی شاعری میں جگہ دی....''۔

(''شاخِ زیتون''۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد ص:25)

''رمزؔ جہاں اپنے کلاسکی مزاج کا پتہ دیتے ہیں، وہیں جدید حسیت ان کی میراث ہے۔ یہ صورتیں نظم میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں اور غزل میں بھی۔ ان کی نظمیں اور غزلیں ایک کہنہ مشق، حساس اور مُلتہب دل رکھنے والے شاعر کا ثبوت فراہم کرتی ہیں، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، رمزؔ اپنی رمزیت کے ساتھ روحانیت کا بھی سفر کرنے لگے۔ اشارے کنائے سے بھری ان کی غزلیں ایک طرف مادی استحصال کے خلاف آواز ہیں تو دوسری طرف روحانی ارتقاع کی داعی ہیں....''۔

(''شاخِ زیتون''۔ پروفیسر وہاب اشرفی ص:19)

درج بالا اقتباس کی روشنی میں اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ رمزؔ نے مختلف وقتوں میں مختلف ادبی رجحانات سے استفادہ کیا؛ لیکن آگے چل کر ان پر مذہبی رنگ غالب آگیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ خالصتاً روحانی اشعار کہنے لگے اور بھی کثرت کے ساتھ۔ اب آیئے ان تمام بیانات وتاثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے رمزؔ کے چند اشعار (شاخِ زیتون سے) دیکھیں:

دائرے سب نے عقائد کے بنا رکھے ہیں
ورنہ مخصوص نہیں کوئی ٹھکانہ تیرا

❁

تم پسینہ مت کہو ہے جانفشانی کا لباس
دھوپ میں چلتے ہوئے رکھتے ہیں پانی کا لباس

❁

ہر نخل نو ہے تیز ہوا کے دباؤ میں
طوفان کا حریف پرانا درخت ہے

❁

زندگی کی تلاش جاری رکھ
لوحِ تربت کو سنگ سیل نہ کر

❁

ہر آدمی کو یہاں دعویٰ خدائی ہے
اکیلی جان ہے کس کس کا احترام کریں

❀

وہ سکونِ دل ہے جو گھر میں کبھی ملتا نہیں ہے
اس گھٹن سے تنگ آ کر میں نے تنہائی خریدی

❀

بس اتنا دیکھو کہ انسانیت بھی ہے کہ نہیں
نہ خاندان، نہ مذہب، نہ قومیت دیکھ

''شاخِ زیتون'' کی غزلوں سے لیے گئے یہ اشعار بھی ''نغمۂ سنگ'' کی طرح رمزؔ کے نمائندہ اور مشہور اشعار نہیں ہیں؛ لیکن ان اشعار کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ رمزؔ کے افکار و نظریات اور جذبات و احساسات کے بہترین ترجمان ہیں۔ گزشتہ سطروں میں یہ عرض کیا گیا کہ رمزؔ کی شاعری پر مختلف وقتوں میں مختلف رجحانات کے اثرات رہے ہیں؛ لیکن عمومی طور پر ان کے یہاں اپنی سوچ اور اپنا انداز بیان حاوی ہے۔ اس انتخاب کا پہلا شعر ہی دیکھیں! پہلے مصرعے میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر آدمی اپنے اپنے خول میں سمایا ہوا ہے، جس سے وہ باہر نہیں آنا چاہتا ہے، اسے ہی کائنات سمجھ بیٹھا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے؛ یعنی وہ مختلف نظریات کے حصار میں محصور رہتے ہوئے بھی کسی ایک مرکز پر نہیں ہے۔ دوسرے شعر میں شاعر نے مزدور کے پسینے کو محض پسینہ کہنے پر تعرض کیا ہے، اس کا یہ ماننا ہے کہ وہ دھوپ کے مسافر ہوتے ہوئے بھی راحت کا سامان اپنے پاس رکھتا ہے؛ یعنی جہدِ مسلسل اسے تھکاتا نہیں؛ بلکہ کامیاب و کامران بنانے کا سبب ہوتا ہے۔ تیسرے شعر شاعر نے ندرت پیدا کرتے ہوئے ایک بالکل نئے نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کے مطابق کمزور اور پسماندہ لوگ اکثر دبائے اور ستائے جاتے ہیں، ان کی کمزوری اور معذوری سے فائدہ اٹھا کر انھیں کچلا جاتا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی کے مخالف نہیں ہیں اور جو مخالف ہے، وہ ہر طرح سے محفوظ اور آسودہ ہوتا ہے۔ وہ اس لیے کہ وہ حد درجہ مضبوط اور بااثر ہوتا ہے۔ چوتھے شعر میں بھی شاعر کے یہاں ندرت خیال کی رعنائی صاف جھلکتی ہے۔ شاعر کے مطابق کسی کا اتباع کرنا اور آنکھ موند کر اس کے نقشِ قدم کو اپنا مقدر تصور کرنا عبث ہے؛ اس لیے آدمی کو چاہیے اپنے لیے کامیابیوں کے نئے راستے خود پیدا کرے۔

رمزؔ عظیم آبادی کے سلیس اور عام فہم اشعار گرچہ ظاہر میں یک رخا محسوس ہوتے ہیں؛ لیکن ان میں بھی رمز اور ایمائیت کا التزام ہے، جسے محسوس کرنے کے بعد ہی شعر کی روح تک پہنچا جا سکتا ہے۔

چھٹے شعر کو دیکھیں، یہاں شاعر نے اپنی داخلی کیفیات کو اہمیت دیتے ہوئے یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ وہ انجمن میں رہ کر، اجتماع میں بیٹھ کر خود کو اکثر تنہا محسوس کرتا ہے۔ وہاں اس کی ذات بے معنی اور بے وقعت نظر آتی ہے؛ اس لیے بھیڑ سے الگ اسے تنہائی اور خود آگاہی کے ماحول میں زندگی بسر کرنی چاہیے؛ تاکہ اس پر زندگی کے راز اور رموز کائنات منکشف ہو سکیں۔ ساتویں شعر میں شاعر نے ایک طرف جہاں انسانیت کے پیغام کو عام کرنے کی کوشش ہے، وہیں اس نے ہر طرح کے قبیلے، قومیت اور مذہبی حصار سے باہر آنے کی ترغیب دی ہے۔ آئندہ کے دو اشعار میں شاعر نے ایک طرف جہاں موجودہ عہد کے سفاک چہرے سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور آنے والے وقتوں میں اس کے کریہہ چہرے کی جھلک دکھلائی ہے۔ وہیں اس نے عوام کو باخبر کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش ہے کہ وقت کہیں ٹھہرتا نہیں، بدلنا اس کی فطرت اور حقیقت ہے؛ اس لیے ذرا سے مفاد اور آسودگی کے لیے کوئی ایسا قدم نہ اٹھے کہ بربادی مقدر بن جائے۔

رمزؔ کے یہاں مذکورہ اشعار کے علاوہ ایسے اشعار کثرت سے ہیں، جو اپنے موضوع، کیفیت اور اشارات کے سبب گہرے معنی اور افکار سے معمور ہیں؛ لیکن اس خاصے کے ساتھ کہ کہیں بھی بے جا علامت، استعارے اور رمز و کنایے کا عمل دخل نہیں؛ یعنی رمزؔ نے اپنی شاعری میں بطور خاص اس امر پر توجہ دی ہے کہ ابہام اور اغلاق معنی و مطالب کی ترسیل میں رکاوٹ نہ بنیں، نیز یہ کہ وہ جو پیغام معاشرے کے دبے کچلے اور اشرافیہ طبقے تک پہنچانا چاہتے ہیں، وہ بہ آسانی پہنچ جائیں اور اس مقصدی شاعری کے دوران بھی وہ فن کی حرمت کو کبھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

رمزؔ کی اس شاعرانہ خصوصیت کو پروفیسر مختار الدین احمد آرزو نے ظاہر کرتے ہوئے اسے اقبال کی شاعری کے قریب بتایا ہے۔ ملاحظہ کریں آرزو صاحب کا یہ اقتباس:

> ''رمزؔ عظیم آبادی ایک غیر مبہم نقطہ نظر کے مالک ہیں اور اپنے شعروں کے ذریعے ایک واضح پیغام قارئین تک پہنچانا ان کا مقصد رہا ہے۔ ایک طرف تو وہ دبے کچلے ہوئے محنت کش کو بیدار ہونے اور اپنا حق بہ زورِ بازو حاصل کرنے کا درس دیتے ہیں تو دوسری طرف عام لوگوں کے دلوں میں اس طبقے کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں؛ لیکن جو بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ رمزؔ اپنے پیام کو پروپگنڈہ نہیں بننے دیتے۔ اس طرح ان کا رشتہ علامہ اقبال سے

جڑ جاتا ہے۔ اقبالؔ کی طرح رمزؔ نے بھی کبھی فکر کو فن پر حاوی نہیں ہونے دیا اور ہمیشہ آداب شاعری کو ملحوظ رکھا، شعری وسائل سے رمزؔ نے پوری طرح کام لیا۔۔۔۔''۔

(''رمزؔ عظیم آبادی: شخصیت اور فن''، ص: 28)

رمزؔ کے یہاں اشعار میں ان کے ذاتی کرب کے ساتھ حالات کا جبر اور اس سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی بدرجہ اتم ملتا ہے۔ وہ کسی بھی صورت میں سپر ڈالنے کو تیار نہیں۔ وہ سنگین سے سنگین حالات میں بھی ہمت و حوصلہ اور تفخر و تفوق کے احساس سے معمور نظر آتے ہیں۔ یہ شاعر کی زندہ دلی اور سخت جانی ہے۔ ''شاخِ زیتون'' سے چند اشعار اور ملاحظہ کریں:

لاکھ بے مایہ ہوں، اتنا بھی تہہ دست نہیں
میری آنکھوں کے صدف ہیں، یہ گہر تیرا ہے

❀

سخنوروں کے لیے ہے وراثت فردا
سنبھال کے مرا حسنِ بیان رکھ دینا

❀

کھیلنے کی عمر ہی میں دنیا داری سیکھ لی
جانے کب رخصت مرا معصوم بچپن ہو گیا

❀

تخم ریزی کر رہا ہوں میں اسی امید پر
پھولتے پھلتے ہوئے کل یہ شجر دیکھیں گے لوگ

❀

تمام رات اندھیروں سے لڑ تو سکتا تھا
یہ مت کہو کہ اکیلا چراغ کیا کرتا

❀

فقیرِ شہر تو ہوں میں گدائے راہ نہیں
کرم کی بھیک نہ دے ایسی بے رخی سے مجھے

مرے جلو میں چلے گا سمندروں کا جلال
نہ روک پائے گا کوئی شناوری سے مجھے

❀

جو انکشاف راز کا مظہر ہے دوستو
مصلوب ہے وہ حرف صلیبِ زبان پر

❀

چراغ فن کو نئے خون کی ضرورت ہے
عظیم آباد کی گلیوں میں یہ صدا دینا
جو رمزؔ کہتے ہیں، مانگے کی روشنی ہے کلام
مری غزل کا انھیں آئینہ دکھا دینا

❀

مندرجہ بالا اشعار تقریباً ایک ہی موڈ اور کیفیت کے ترجمان ہیں۔ رمزؔ کے یہاں تعلّی اور نرگسیت کا عنصر تو پایا جاتا ہے؛ لیکن یہ تعلی اور خود ستائی سچائی سے قریب محسوس ہوتی ہے۔ ایک طرف جہاں وہ اپنی مائیگی کا ذکر کرتے ہیں تو دوسری طرف اسے فکر یہ طور پر لیتے ہیں۔ وہ اپنے بیشتر اشعار مین یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کم مائیگی، ناداری اور محرومی کے باوجود ان کے یہاں فن شاعری کا بیش بہا خزانہ ہے، جسے آنے والے وقتوں میں پورے طور پر سمجھا جائے گا۔ رمزؔ فرد کو ایک تنہا انسان نہیں؛ بلکہ ایک انجمن تصور کرتے ہیں اور پوری دنیا سے لوہا لینے کا عزم رکھتے ہیں۔ رمزؔ کو ادب کے تازہ اذہان اور نئی نسلوں سے بہت امید ہے؛ کیوں کہ یہی لوگ تمام تر تعصّبات اور تحفظات سے اوپر اٹھ کر اصل فنکار کی شناخت کریں گے اور اس کے اصل مقام و مرتبے کا تعین کریں گے۔

اب اخیر میں رمزؔ کے کچھ نمائندہ اور مقبول عام اشعار ملاحظہ کریں۔ یہ اشعار ان کے دونوں مجموعوں سے ماخوذ ہیں۔ پہلے یہ نعتیہ اشعار ملاحظہ کریں:

سرِ انسانیت کا مصطفیٰؐ کو تاج کہتے ہیں
عروج آدمیت کو شبِ معراج کہتے ہیں

❀

یہ کائنات چودہ ورق کی کتاب ہے
ہر ہر ورق پہ نام رسالت مآب ہے

❁

مدح رسول پاک سے حاصل ہے یہ شرف
ظلمت میں روشنی کا وسیلہ ہے ہر طرف

❁

اب چند غزلیہ اشعار جو عوام و خواص میں مقبول ہیں:

جب تک تھکن نہیں تھی رہا میں حریف موج
احساس خستگی ہی تہہِ آب لے گیا

❁

ملے تو اس سے محبت کی گفتگو سیکھو
تمہارے شہر میں ایک شخص بے زبان بھی ہے

❁

بیچ کے ہم تقدسِ غزل کو سوداگر کہلائیں گے
شیشے کا بیوپار کریں گے خود پتھر بن جائیں گے

❁

آنے والی نسلیں ہم کو بھول سکیں، ناممکن ہے
نقشِ قدم کے مٹتے مٹتے راہ گزر بن جائیں گے

❁

جنابِ رمزؔ ہے باہر ہجوم بے ہنراں
چھپائے بیٹھے رہیں دولت ہنر گھر میں

❁

کبھی وہ میری گزر گاہ بن نہیں سکتی
رمانہ روند کے چلتا ہے جن زمینوں کو

❁

زندہ رہنا ہے تو فن کا جائزہ لیتے رہو
شعر کہتے ہو تو لفظوں کی دعا لیتے رہو

❁

مرے نہ ہونے کا غم دوست کو بجا و درست
سوال یہ ہے کہ دشمن کی آنکھ نم کیوں ہے

❁

سلیقہ گفتگو کا جھوٹ کو بھی سچ بناتا ہے
تو پھر لفظاب سیکھ لے زبان معتبر کو

❁

اوپر نقل کیے گئے اشعار کی پہلی قرأت سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ رمزؔ کے یہاں موضوعات میں کس قدر وسعت ہے اور وہ مختلف کیفیات کو شعری قالب میں ڈھالنے میں کس قدر مشاق ہیں۔ رمزؔ اپنے عہد کو بہت گہرائی سے سمجھتے ہیں؛ اس لیے ان کے یہاں ان کے خالص اپنے تجربات بہت ہی حقیقی روپ لے کر عیاں ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک بڑی خصوصیت فنکاروں اور ادب نوازوں کو باخبر کرنے کی بھی ہے۔ وہ ہر مقام پر اصل فنکار کی شناخت پر زور دیتے ہیں۔ نیز وہ شاعری کو عبادت سمجھتے ہوئے لفظ کی حرمت اور فن کی قدر و منزلت کو ہمیشہ اوّلیت دیتے ہیں، ان کے مجموعے ''نغمۂ سنگ'' اور ''شاخِ زیتون'' میں شامل اکثر غزلیں اپنے گرد و پیش اور اپنے عہد کو پورے طور پر منعکس کرنے میں کامیاب ہیں۔ ساتھ میں شعریت، نغمگی اور حلاوت ان کی شاعری کو تادیر زندہ رکھنے میں حد درجہ معاون ثابت ہوتی ہے۔

❁

رمزؔ عظیم آبادی کی قطعات ورباعیات نگاری

رمزؔ عظیم آبادی کے یہاں قطعات و رباعیات بھی کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں، گرچہ یہ نظم اور غزل کے مقابلے میں بہت کم ہیں؛ لیکن کیفیت کے اعتبار سے یہ بیش قیمتی موتی سے کم نہیں ہیں۔ ''شاخِ زیتون'' میں شامل ان کے قطعات اور رباعیات کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہاں بھی رمزؔ کا ذاتی کرب موجود ہے، یہاں بھی زمانے کی بے رخی اور بے اعتنائی ظاہر ہے، یہاں بھی رمزؔ کی خوداعتمادی اور احساسِ تفخر غالب ہے۔ظاہر ہے کہ سانچہ بدل جانے سے شاعر کے نظریات نہیں بدلتے ،اس کے ذاتی تجربات ومشاہدات تبدیل نہیں ہوتے۔

قطعہ نگاری کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ دواشعار کا مجموعہ ہوتا ہے، جب کہ اساتذہ کے یہاں ایسے بھی قطعات دیکھنے کو مل جاتے ہیں، جن میں دو سے زیادہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ بہر حال قطعہ اکثر و بیشتر مطلع سے آزاد ہوتا ہے اور ہر شعر کا دوسرا مصرعہ قافیہ وردیف سے مزین ہوتا ہے۔قطعہ نگاری کا مقصد بہ زبان امداد امام اثر (بحوالہ کاشف الحقائق) حقیقت بیان کرنا ہوتا ہے۔

قطعہ نگاری کے اس مختصر تعارف کے بعد جب ہم رمزؔ عظیم آبادی کے قطعات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس فن کے رموز اور تقاضے سے پوری طرح واقف ہیں اور انھوں نے اپنے قطعات میں حقیقت کے علاوہ کچھ نہیں باندھا ہے۔ رمزؔ کی شاعری جو کہ مست کرنے اور تفریح کا سامان مہیا کرانے کے لیے نہیں ہے؛ اس لیے ان کے یہاں حقیقت بیانی کا عنصر زیادہ سے زیادہ ہے

اور ظاہر ہے جہاں حقیقت بیانی ہوگی، وہاں تلخی بھی آئے گی اور رنج وملال کی کیفیت بھی ظاہر ہوگی۔ رمزؔ کے متعلق اوپر یہ کہا گیا کہ ان کی نظموں اور غزلوں کی طرح ان کے قطعات بھی ان کے دلی جذبات واحساسات کا آئینہ ہیں۔اس بات کی دلیل کے طور پر متعدد قطعات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ (جنھیں آگے نقل کیا جائے گا)

رمزؔ کے یہاں ان کی رباعیات میں بھی وہی صورتحال ہے، جس کے متعلق ابھی کہا گیا۔ان کی رباعیاں بھی ان کی خالص اپنی ذات اور احوالِ کائنات کی عمدہ مثالیں ہیں۔ یہاں بھی انھوں نے اپنا سابقہ شعری موقف جاری رکھتے ہوئے اپنی باتوں کی ترسیل پر زور صرف کیا ہے۔

اردو شاعری میں عام طور سے رباعی اس صنف سخن کو کہا جاتا ہے، جو چار مصرعوں پر مشتمل ہوتے ہوئے ایک مکمل اور بھرپور مضمون کو ادا کرے۔ رباعی کا وزن مخصوص اور طے شدہ ہوتا ہے۔اس میں پہلے دوسرے اور آخری؛ یعنی چوتھے مصرعے میں قافیے کا التزام ضرور ہوتا ہے؛ لیکن اگر کسی شاعر نے تیسرے مصرعے میں بھی قافیے کا استعمال کرلیا ہو تو یہ کوئی عیب نہیں کہلائے گا۔ رباعی کے موضوعات کے متعلق اہل فکر کا کہنا ہے کہ اس کے موضوعات پہلے سے مقرر نہیں ہوتے ،اس میں ہر طرح کے موضوعات کو لایا جاسکتا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ رباعی کے آخری دو مصرعے کا حسن اور اس کا اثر فوری طور پر ظاہر ہوکر سامنے آسکے۔

رباعی کے فن کو علمائے ادب نے بہت مشکل فن قرار دیا ہے۔ اس صنف شاعری کی فنی باریکیوں اور پیچیدگیوں کو تقریباً تمام مشاہیر شعرا اور اہل فن نے تسلیم کیا ہے۔ اس بابت جوش ملیح آبادی نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''رباعی ایسی کم بخت چیز ہے جو سارا جوبن کھالے تو ایک ایک بالک پالے' کی طرح چالیس برس کی مشاقی کے بعد کہیں جا کر قابو میں آتی ہے .... یہ کافر صفت بڑے بڑوں کے بھی قابو میں اس وقت تک نہیں آتی جب تک کہ زمانے کی سرد وگرم ہوائیں شاعر کی حساس ومفکر زندگی کے تقریباً چالیس پچاس ورق نہیں الٹ دیتی''۔

(''تنقیدی جہات''۔نسیم احمد نسیم،ص:163)

جوش کے علاوہ قدما میں انشاء اللہ خاں انشاء، وحیدالدین سلیم، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مولانا احسن مارہروی اور مرزا فدا علی نے بھی اس فن کی بابت مشکل گوئی کا اعتراف کیا ہے۔

ان اقتباسات کی روشنی میں اگر رمزؔ عظیم آبادی کی رباعیات کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رباعی کے فن کی بابت نہ صرف پوری واقفیت رکھتے ہیں؛ بلکہ بہت ہی مشاقی اور چابک دستی کے ساتھ اس صنف کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے ہر طرح کے مضامین کو باندھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔

اب ملاحظہ کریں چند قطعات و رباعیات: (یہ شاخِ زیتون سے ماخوذ ہیں)

موسم نے گر ذرا بھی کہیں رخ بدل دیا
آرام کا یہ سارا بھرم ٹوٹ جائے گا
کاغذ کا سائبان غنیمت ہے دھوپ میں
برسات کے دنوں میں کہاں سر چھپائے گا

❁

درد کو دل کی کسوٹی پہ پرکھ لیتی ہے
ذائقہ خونِ تمنا کا بھی چکھ لیتی ہے
جن کی آواز سنائی نہیں دیتی ہے مجھے
زندگی گن کے انہی لمحوں کو رکھ لیتی ہے

❁

نغموں میں سوز و درد بھی شامل ہیں ہم نشیں
اشکوں کے کچھ دیئے ہیں چراغِ طرب کے ساتھ
جو مٹ گئے وطن کی حفاظت کے واسطے
تاریخ ان کو یاد کرے گی ادب کے ساتھ

❁

اسی پر انحصارِ زندگی ہے
بہلنا خواب ہے اور شاد ہونا
کچل دیتا ہے انساں کی انا کو
غریب اور صاحبِ اولاد ہونا

❁

ایک چنگاری دہکتی بھٹیوں کی زندگی
اس میں جتنی بھی ضرورت تھی وہ انگاروں میں ہے
سانس جتنی کم ہوئی ہے میری فکرِ رزق میں
وہ لہو بن کر مرے بچوں کے رخساروں میں ہے

❁

کرمکِ شبِ تار کی مانند تا بندہ رہا
کار نامہ ہے یہی میرا کہ میں زندہ رہا
ان کے بچپن کی کوئی ضد بھی نہ پوری کر سکا
زندگی بھر اپنے ہی بچوں سے شرمندہ رہا

درج بالا قطعات و رباعیات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے شروع میں جہاں زندگی سے شکوہ کیا ہے اور زندگی کے جبر کو دردناک لہجے میں بیان کیا ہے۔ وہیں وہ وطن پر جان نثار کرنے والوں کو یاد کرتے ہوئے انھیں ہمیشہ کے لیے امر تصور کرتے ہیں۔ آگے چل کر شاعر نے انسان کی اَنا اور خاص طور سے ایک غریب اور مفلوک الحال انسان کی اَنا کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ شاعر کے مطابق انا اور خودداری انسان کا وصفِ خاص ہے؛ لیکن ایسے غریب اور نادار کے لیے یہ بہت ہی مہلک ہے، جو وسائل سے محروم ہوتے ہوئے بھی صاحب اولاد ہو۔

اس سلسلے کے آخری دو نمونوں میں رمزؔ عظیم آبادی نے خالصتاً اپنی ذات اور نجی حالات کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔ شاعر کے مطابق پیٹ کی آگ انسان کو زیروزبر کر کے رکھ دیتی ہے اور انسان کی عمر جب جب بڑھتی جاتی ہے، فکرِ معاش اور فکرِ رزق بڑھتی جاتی ہے اور بالآخر اس کے اثرات اس کے بچوں کے چہروں پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔

اخیر میں شاعر نے خود کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا درد اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام تر نامساعد حالات میں بھی میں حیرت انگیز طور پر زندہ رہا۔ میں نے اپنے بچوں کی معمولی خواہشات اور ضروریات کو پورا نہیں کیا۔ یہ رنج اور قلق شاید کبھی پیچھا نہیں چھوڑے گا اور اپنی اولاد کے سامنے ہی ہمیشہ شرمندہ رہنا پڑے گا۔ رمزؔ کے قطعات اور رباعیات بھی ان کی زندگی اور ان کے فن کی زندہ مثالیں ہیں؛ اس لیے ان کے مطالعے کے دوران ان کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

نظمیں

صبحِ تمنا

سہمی ہوئی کلی ہے نگہ دار کون ہے
مایوس زندگی ہے خطا وار کون ہے
مجروح قلبس امن ہے تلوار کون ہے
اب دیکھنا یہ ہے کہ سردار کون ہے
دل میں ہزاروں زخم ہیں ناسور ہی نہیں
میری نظر میں صرف جبل پور ہی نہیں

قاتل کھڑا ہے وقت کے منصف کے روبرو
دامان و آستیں میں چھپائے ہوئے لہو
لہجہ بہت حسین ہے معصوم گفتگو
انصاف کی نگاہ میں بنتا ہے سرخرو
صورت کچھ آشنا سی ہے پہچانتا ہوں میں
صدیاں گزرگئی ہیں ؛ مگر جانتا ہوں میں

❁

یہ عہد نو میں بھیس بدلتا رہا ہے یہ
انسان کا خون چہرے پہ ملتا رہا ہے یہ
فسطائیت کی گود میں پلتا رہا ہے یہ
تخریب کے اصول پہ چلتا رہا ہے یہ
کمزور کے لیے ستم ایجاد بن گیا
فرعون بن گیا کبھی شدّاد بن گیا

رنگِ بہار تو بہ شکن اس کے ہاتھ میں
شرحِ حدیث حسنِ چمن اس کے ہاتھ میں
زنداں تیغ و دارو رسن اس کے ہاتھ میں
تاجر یہ موت کا ہے کفن اس کے ہاتھ میں
کیفیت تضاد کا پیکر یہی تو ہے
تاریخ کہہ رہی ہے ستم گر یہی تو ہے

نیروؔ یہی یزیدؔ یہی زارؔ بھی یہی
راونؔ یہی ہے کنسؔ جفا کار بھی یہی
ہٹلرؔ یہی ہے نادرؔ خونخوار بھی یہی
قیصرؔ یہی ہے فتنۂ تاتار بھی یہی
منسوب اس سے سلسلۂ قتل عام ہے
اس کی نظر میں پھول پہ شبنم حرام ہے

شیلیؔ کو اور کیٹسؔ کو پہچانتا نہیں
غالبؔ کو میرؔ و سوداؔ کو یہ جانتا نہیں

❁

تلسیؔ کو کالی داسؔ کو بھی مانتا نہیں
پلکوں سے یہ شراب کبھی چھانتا نہیں
ناآشنائے سایۂ زلفِ دراز ہے
محمود کا حریف ہے یہ وہ ایاز ہے

اس کی نظر میں رسمِ محبت بھی جرم ہے
پاکیزگی گناہ ہے عصمت بھی جرم ہے
بادِ صبا فریب ہے نکہت بھی جرم ہے
بھونروں کا رقصِ گل کی لطافت بھی جرم ہے
لاشیں اسے عزیز ہیں تاجر ہے آگ کا
دشمن سکون کا ہے یہ رہزن سہاگ کا

پازیب کی صدا ہو کہ کنگن کی نغمگی
ہو چوڑیوں کا گیت کہ آنچل کی دلکشی
زلفوں کی رات عارض تاباں کی چاندنی
ترشے ہوئے لبوں کی پُراسرار سی ہنسی
پیراہنوں میں آگ لگاتا رہا ہے یہ
عورت کو ننگی کرکے نچاتا رہا ہے یہ
روداد کوریا ہوکہ الجیریا کی بات
افسانۂ دمشق کہ دستِ بلا کی بات
یورپ کی داستانِ ستم ایشیا کی بات
جب بھی چلی ہے بزم میں رسمِ جفا کی بات

پڑنے لگی شکن سی جبینِ حیات پر
بارود کا دھواں ہے رُخِ کائنات پر
مشق ستم کے واسطے صحرا ہے آج بھی
طوفان بدوش وسعتِ دریا ہے آج بھی
تاراجیٔ حیات کا خطرہ ہے آج بھی
چھایا ہوا جہاں پہ دھندلکا ہے آج بھی
پھر اہتمام دار ورسن ہے صلیب ہے
بڑھتے چلو کہ ''صبح تمنا'' قریب ہے
لوتیز ہوگئی ہے چراغوں کی شام سے
مئے کے عوض چھلکنے لگا خون جام سے
سہمی ہوئی ہے ظلم کی طاقت عوام سے
نسبت ہے افریقہ کو لومبا کے نام سے
تحریک حریت کو جفا کیا دبائے گی
مسلے ہوئے گلاب کی خوشبو نہ جائے گی

حدیث معتبر

ہندوستاں میرا وطن   میرا وطن ہندوستاں
شعلہ بدن شبنم صفت   بادِ صبا نکہت فشاں
مجموعۂ حسنِ چمن   کیفیتِ چشم بتاں
میرے جلو میں رنگ و بو   میری نظر میں بجلیاں
رشتوں کی صحبت میں رہی   ہندی بہن بھارت ہے ماں
ہندوستاں میرا وطن
میرا وطن ہندوستاں
میرے فسانے یم بہ یم   صحرابہ صحرا داستاں
میرے خرامِ ناز سے   منسوب ہے جوئے رواں
میری حدیث شوق کی   تفسیر بزمِ مہوشاں
تاریخ میری ہمسفر   منزل مری سارا جہاں
ہندوستاں میرا وطن
میرا وطن ہندوستاں
سلمٰی کے گھر کی لاڈلی   سیتا نے پالا ہے مجھے
اک مشترک تہذیب کے   سانچے میں ڈھالا ہے مجھے
ہندی نے اپنی گود میں   صدیوں سنبھالا ہے مجھے
پنجاب سے آسام تک   میرے ہی قدموں کے نشاں
ہندوستاں میرا وطن
میرا وطن ہندوستاں
مستی؟ صہبائے عرب   کیفِ مئے شیراز ہوں
شیخ و برہمن سب مرے   میں وہ بُتِ طنّاز ہوں

گیتا کی دلکش نغمگی   قرآن کی آواز ہوں
گنگ وجمن کا گیت ہوں   دیر و حرم کی داستاں
ہندوستاں میرا وطن
میرا وطن ہندوستاں
میں کرشن کی بنسی بھی ہوں   داؤدؑ کی آواز بھی
آنکھوں میں سحرِ سامری   دل میں حرم کا راز بھی
میری صدائے درد میں   جادو بھی ہے اعجاز بھی
میری ادا میں بانکپن   شرم و حیا میں شوخیاں
ہندوستاں میرا وطن
میرا وطن ہندوستاں
زلفوں میں بوئے مشک ہے   سارا بدن گلنار ہے
پھولوں کا رس چہرہ پہ ہے   دامن میرا گلزار ہے
ماتھے پہ جھومر چاند کا   اور نطق گوہر بار ہے
ابرو مرے قوس قزح   نقش قدم ہے کہکشاں
ہندوستاں میرا وطن
میرا وطن ہندوستاں
الفاظ جو پیارے ملے   وہ مجھ میں صنم ہوتے گئے
ٹوٹے نہ پیمانِ وفا   قول و قسم ہوتے گئے
ہوکر شریک بزم گل   شعلے بھی نم ہوتے گئے
میں وقت کی آواز ہوں   تہذیب نو کی ترجماں
ہندوستاں میرا وطن
میرا وطن ہندوستاں
میں سنگ بھی فولاد بھی   لوہا بھی ہوں پتھر بھی ہوں

پروین بھی انجم بھی ہوں   زہرا بھی ہوں اختر بھی ہوں
مانک بھی ہوں موتی بھی ہوں   ہیرا بھی ہوں گوہر بھی ہوں
میری نگاہوں میں نہیں   اندیشۂ سود و زیاں
ہندوستاں میرا وطن
میرا وطن ہندوستاں
میں جادۂ دشوار پر   چلنے سے گھبراتی نہیں
دار و رسن کے خوف سے   غدّار بن جاتی نہیں
جب وقت گیرو دار ہو   رنگیں غزل گاتی نہیں
شاہد ہے میری بات کی   آزادئ ہندوستاں
ہندوستاں میرا وطن
میرا وطن ہندوستاں
نجدیؔ نہیں ترکیؔ نہیں   ہندی ہوں میں ایرانؔ میں
کس طرح ہو میرا وطن   لاہورؔ میں ملتانؔ میں
میں بھی مہاجر کی طرح   پہونچی تھی پاکستان میں
یوں رہزنِ تقسیم نے   لوٹا ہے میرا کارواں
ہندوستاں میرا وطن
میرا وطن ہندوستاں
دردِ غلامی میں رہی   میں بھی پرستارِ وطن
میں نے بھی خوں دے کر کیا   شاداب رخسارِ وطن
میرا بھی حق ہے ملک پر   میں بھی ہوں معمار وطن
اے رہنمایانِ وطن   میں ہوں وہی اردو زباں
ہندوستاں میرا وطن
میرا وطن ہندوستاں

زندگی

زندگی موجِ رواں نکہت گل رقص شرر   زندگی شب کی سیاہی رخِ زیبائے سحر
زندگی دشت میں بےچین مسافر کی نظر   زندگی زادِ سفر، زحمتِ سفر، عزم سفر
زندگی کھلتے ہوئے پھول کی شادابی ہے
زندگی جلتی ہوئی شمع کی بیتابی ہے
زندگی فلسفۂ عشق و نگاہِ حکمت   زندگی ایک کہانی بہ زبانِ فطرت
زندگی ذوق خلش شرح حدیثِ جنت   زندگی آدم وحوا کے دلوں کی وسعت
زندگی عارضِ گیتی کے لیے غازہ ہے
زندگی جرم نہیں جرم کا خمیازہ ہے
زندگی برق ہے کیفیت سیمابی ہے   زندگی پھول پہ شبنم کی خنک تابی ہے
زندگی منعم مغرور کی بے خوابی ہے   زندگی کن کا کرشمہ نہیں اسبابی ہے
زندگی بزم طرب بھی رسن و دار بھی ہے
زندگی پھول سی نازک بھی ہے تلوار بھی ہے
زندگی فلسفۂ عشق و نگاہِ حکمت   زندگی ایک کہانی بہ زبانِ فطرت
زندگی ذوق خلش شرح حدیثِ جنت   زندگی آدم وحوا کے دلوں کی وسعت
زندگی بزم طرب بھی رسن و دار بھی ہے
زندگی پھول سی نازک بھی ہے تلوار بھی ہے
زندگی شامِ ابد کیف تمنائے وصال   زندگی شاعر خوش فکر کی پورا خیال
زندگی پگھلی ہوئی برف ہمالہ کا جلال   زندگی سائل خود دار کا خاموش سوال
زندگی آتش نم شعلۂ رعنائی ہے
زندگی خاک کی تو پیڑ ہوئی انگڑائی ہے

زندگی سنگ گراں بھی ہے گل تر بھی ہے   زندگی لعل و جواہر بھی ہے پتھر بھی ہے
زندگی زہر بھی، تریاق بھی، نشتر بھی ہے   زندگی مونس و ہمدم بھی ستمگر بھی ہے
نیاز اس سے جو رہتے ہیں صلہ دیتی ہے
ہاں! مگر چاہنے والوں کو سزا دیتی ہے
یہ تھی پنہاں لبِ عیسیٰؑ کی مسیحائی میں   یہ تھی شامل یدبیضا کی تماشائی میں
اس کا گھر دل منصور کی گہرائی میں   ہاتھ اس کا پسر نوح کی رسوائی میں
اس نے سقراط کو پینے کو دیا زہر کا جام
وہ زلیخا ہے جو یوسفؑ کو بناتی ہے غلام
کارفرما ہے تصور کی سمن زاروں میں   مسکراتی ہے دہکتے ہوئے انگاروں میں
رقص کرتی ہے یہ زنجیروں کی جھنکاروں میں   یہ سنور جاتی ہے منھ دیکھ کے تلواروں میں
رزم گاہوں میں یہی شعلۂ جوالہ ہے
موت خود جس کی نگہباں ہے قتالہ ہے
شانہ گر جس کی تاریخ و گیسو ہے یہی   سب کے حق میں جو کشادہ وہ پہلو ہے یہی
آئینہ تکتا ہے منھ جس کا وہ مہ رو ہے یہی   عقل کرتی ہے جو محسوس وہ خوشبو ہے یہی
ایک نغمہ ہے جسے ساز کی حاجت ہی نہیں
وہ ترنم ہے کہ آواز کی حاجت ہی نہیں
اہل دل کے لیے تنہائی میں بنتی ہے مشیر   ترجمہ ہوتا ہے اس شوخ کا انساں کا ضمیر
ایسی معصوم ہے یہ جیسے سحر کی تنویر   زندگی آدم وحوا کے دلوں کی وسعت
ڈھونڈھ ہی لیتی ہے یہ اپنے خریداروں کو
حوصلہ دیتی ہے دم توڑتے ناداروں کو

نقشِ دوام

تاج فخرِ صنعتِ ہندوستاں   تاج فن کا ایک نقش جاوداں
تاج چشم عشق کا خواب جواں   تاج تصویر دل شاہِ جہاں
تاج جو راحت گہہ ممتاز ہے
فن و صناع کااک اعجاز ہے
عشق کی آنکھوں کا آنسو تاج ہے   حسن کی زلفوں کی خوشبو تاج ہے
اک کشش انگیز جادو تاج ہے   شانہ ہے تاریخ گیسو تاج ہے
تاج دستِ عشق کا شہ کار ہے
اک حدیثِ کا کل و رخسار ہے
منتہائے آرزوئے عشق ہے   خامشی خود گفتگوئے عشق ہے
جلوہ گاہِ حسن کوئے عشق ہے   اس کے ہرذرے میں بوئے عشق ہے
حسن کو فن کا سہارا مل گیا
سنگ مرمر کا شگوفہ کھل گیا
تاج ہے رودِ جمن کی آبرو   بخت خسرو کو ہکن کی آبرو
ایشیا کے علم و فن کی آبرو   سینہ چاکانِ وطن کی آبرو
حسن محفوظ نظر کر لیجئے
دل کا ساغر کیف سے بھر لیجئے
دلربا منظر بھی ہے عبرت بھی ہے   وصل کا مژدہ بھی ہے فرقت بھی ہے
درد کا احساس بھی راحت بھی ہے   جس نظر سے دیکھئے حسرت بھی ہے
میرؔ کے اشعار کی تفسیر ہے
کیٹس کے احساس کی تصویر ہے

. . . . . کی حقیقت ہے یہی   ندرتِ فن حسن صنعت ہے یہی
بارگاہ حسن و الفت ہے یہی   گم شدہ ملٹن کی جنت ہے یہی
بے خزاں پھولوں کا مسکن تاج ہے
چاند منہ دیکھے وہ درپن تاج ہے
چاندنی شب اس پہ مرمر کا جمال   یادگار عہد رفتہ حسن حال
انبساطِ روح فردوسِ خیال   ہجر کا قصہ بہ عنوانِ وصال
سطوتِ شاہی خلوص فن بھی ہے
کچھ دل بیتاب کی دھڑکن بھی ہے
تاج فردوسی نظاروں کا وطن   چاندنی کا شہر تاروں کا وطن
سر و قد سب میں نگاروں کا وطن   فصل گل کا لالہ زاروں کا وطن
صبح کی صورت نکھرتی ہے یہاں
زندگی پہروں سنورتی ہے یہاں
ہوتے ہی شب کے اسیر دامِ صبح   تاج کے دامن میں چھلکا جامِ صبح
ذرہ ذرہ کو ملا پیغامِ صبح   یہ گماں دل کو ہوا ہنگامِ صبح
جب کلی چٹکی کوئی آواز سے
جاگ اٹھی ممتاز خواب ناز سے
یاد ہیں وہ جگمگاتی انگلیاں   پتھروں کو گد گداتی انگلیاں
بربط فن کو بجاتی انگلیاں   سنگ میں دوہ گاتی انگلیاں
انگلیوں سے خوں ٹپک کر رہ گیا
آسماں کا دل دھڑک کر رہ گیا
تاج ہے محنت کشوں کی یاد گار   فکر کی جنت مشقت کا وقار
کتنی پیشانی کا درّ شاہسوار   علم و صنعت کا حسیں آئینہ دار
یہ مرقع ہے کسی کے پیار کا
تاج پہ حق ہے مگر فنکار کا

رحمتِ جزو وکل

وہ نورِ اوّلیں کونین میں جس کا اُجالا ہے
بھنور میں آدمیت سے سفینے کو سنبھالا ہے
جہان کے پیچ وخم میں معتدل رستہ نکالا ہے
خدا کا لاڈلا محبوب کالی کملی والا ہے

زمیں نازاں ہوئی ممدوحِ قرآنِ مبیں آئے
رسولوں کے رسول آئے امینوں کے امیں آئے

وہ جن کے جسم کی خوشبو ہے سرمایہ بہاروں کا
وہ جن کی زلف کا صدقہ ترنم آبشاروں کا
وہ جن کی گردِ پا سے بڑھ گیا رتبہ ستاروں کا
سہارا آ گیا دنیا کے سارے بے سہاروں کا

نکلتا ہے جو سورج ہر کسی کے کام آتا ہے
شعاعِ مہر سے مٹی کا گھر بھی جگمگاتا ہے

مدینے کی ہوائیں نعتِ احمدؐ گنگناتی ہیں
بہاریں ہر گلی کوچے کو خوشبو سے بساتی ہیں
رہِ طیبہ میں حوریں فرش زلفوں کا بچھاتی ہیں
پرِ جبریل سے سورج کی کرنیں چھن کے آتی ہیں

دلِ کونین میں دھڑکن ہے جن کے مسکرانے سے
زمانہ ان سے باہر ہے نہ وہ باہر زمانے سے

صحیفوں میں بھی نام آیا رسولوں نے شہادت دی
زمیں خوش بخت ہے کہ آسمانوں نے بشارت دی

تیمّم پاک کردے خاک کو ایسی طہارت دی
خدا نے مصطفیٰ کی شکل میں دنیا کو رحمت دی

نسیم صبح لے کر مژدۂ آرام آتی ہے
ہرا کرتی ہے کانٹوں کو گلوں کے کام آتی ہے

یقیناً آدم و حوا کا افسانہ ضروری تھا
وجودِ شمع لازم ہے تو پروانہ ضروری تھا
جہاں کو معنی رحمت بھی سمجھانا ضروری تھا
محمد مصطفیٰؐ کا اس لیے آنا ضروری تھا

گھٹا اٹھتی ہے تو سیراب کرتی ہے زمانے کو
نمی دیتی ہے مٹی کو نمو دیتی ہے دانے کو

چمک ہر عرش اعظم کی نبوت کے نگینے میں
متاعِ دین و دنیا ہے محمدؐ کے خزینے میں
عرب کیا ہے عجم کا دور بھی رکھتے ہیں سینے میں
نظر ساری خدائی پر مگر گھر ہے مدینے میں

وہ چاہے ایشیا ہو یا کہ یورپ رد نہیں کرتی
ہوا چلتی ہے تو پابندئ سرحد نہیں کرتی

کریمی جزو عادت بھی عمل میں وصف رحمت بھی
عبادت بھی طہارت بھی نفاست بھی لطافت بھی
قناعت بھی سخاوت بھی شجاعت بھی محبت بھی
دو عالم کی شہنشاہی مگر فاقہ بھی غربت بھی

لباسِ خاک میں ہوتے ہوئے بھی فطرتاً نوری
ہوئی ہر طرح شرطِ رحمت للعالمیں پوری

نہ پھولوں کی ہنسی آتی نہ شبنم میں نمی ہوتی
نہ عرفانِ خدا ہوتا نہ کوئی آ گہی ہوتی
ادھورا آدمی ہوتا ادھوری زندگی ہوتی
اجالے کو ترستے تیرگی ہی تیرگی ہوتی
فراقِ مصطفےٰ میں یہ زمیں محور سے ہٹ جاتی
خدا شاہد ہے پھر سورج کی جانب یہ پلٹ جاتی
زمیں سرسبز ہوتی اور نہ روشن آسماں ہوتا
خلاؑ میں صرف سناٹا ہی رہتا اور دھواں ہوتا
کوئی منزل کوئی جادہ نہ کوئی کارواں ہوتا
اگر وہ رحمتِ عالم نہ اپنے درمیاں ہوتا
نہ کوئی دلکشی ہوتی نہ فطرت ناز فرماتی
یقیناً جینے والی چیز جینے کو ترس جاتی
خراشِ جسم بھی ہرگز نہ ختم المرسلیں دیتے
جری ایسے جراحت کا فروں کو بالیقیں دیتے
اگر یہ چاہتے اعاد کو مقتل کی زمیں دیتے
عصا رکھتے ہیں دشمن کو قریب آنے نہیں دیتے
اگر کشتہ کہیں دستِ رسالت سے لعیں ہوتے
تو ان کے حق میں کیسے رحمۃ للعالمیں ہوتے

❋

تاریخ کی آواز

اپنی آنکھوں کو نچوڑا تو لہو ٹپکا تھا
کرچیاں خوابوں کی چنتے رہے بے خواب رہے
آبلے پھول کھلاتے رہے صحراؤں میں
ہم کڑی دھوپ میں نکلے بھی تو شاداب رہے
''جلیانہ'' کے شہیدوں کا لہو زندہ ہے
''مالٹا'' صفحۂ تاریخ پہ تابندہ ہے
روشنی جاگی تو زنداں کی سلاخیں چمکیں
خندۂ صبح سے ظلمت کا جگر چاک ہوا
حسن لیلیٰ وطن حوصلۂ دارورسن
عشق بیباک تھا بیباک تھا بیباک ہوا
جبر سے آنکھ ملانے کا ہنر آ ہی گیا
آگ میں پھول کھلانے کا ہنر آ ہی گیا
سرفروشوں نے کیا حسنِ عمل کا اظہار
برق سنگین ستم خرمن جاں تک پہنچی
بات جو صدیوں سے ممنون سماعت نہ ہوئی
ضبط کی حد سے جو گزری تو زباں تک پہنچی
ظلم تاریخ کی آواز سے گھبرا ہی گیا
اور پھر ٹیمز کی موجوں کو جلال آ ہی گیا
سینۂ اہلِ وطن زخموں کا گنجینہ ہوا
پھول جلنے لگے بڑھتی رہی بارود کی بو
چارہ ساز آ ہی گیا زخموں کا مرہم لے کر
رنگ لانے لگا بھارت کے سپوتوں کا لہو
گفتگو جبر کی پھر مصلحت آمیز ہوئی
روشنی تیز ہوئی تیز ہوئی تیز ہوئی

اک کمزور سی آواز کا جادو جاگا
باب زنداں کھلا زنجیر و سلاسل ٹوٹے
لے کے انگڑائی اٹھے زندہ دلان بھارت
سرنگوں تیغ ہوئی بازوئے قاتل ٹوٹے
تیرگی کھا ہی گئی صبح تمنا سے شکست
حاصلِ خون شہیداں وطن پندرہ اگست
اپنی آزادی کا مفہوم نہ سمجھے افسوس
آج جنت پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے
کیا اسی واسطے مانگی تھی اجالوں کی دعا
آگ شہروں میں بھڑکتی ہے دھواں ہوتا ہے
دیکھ سکتے ہو تو دیکھو وطن جلتا ہے
آگ پھولوں نے لگائی ہے چمن جلتا ہے
آؤ یہ عہد کریں ہم کہ وطن میں ہر سمت
پیار کے دیپ جلائیں گے اجالاں کے لیے
حسنِ پنجاب پہ آنچ آنے نہ دیں گے ہرگز
اور کڑکیں گی کمانیں نہ غزالوں کے لیے
زلفِ بنگال کو برہم نہیں ہونے دیں گے
شمع آزادی کی لو کم نہیں ہونے دیں گے
اجنبی ہاتھ بُنیں لاکھ اندھیرے لیکن
دوستوں اپنی ہتھیلی پہ سحر لے کے چلیں
نم جو ہوجائے تو زرخیز ہے مٹی اپنی
زخم دل لے کے چلیں دیدہ تر لے کے چلیں
آج پھر اپنی ہواؤں کو چمن ساز کریں
اک نئی صبح نئے دور کا آغاز کریں

غزلیں

❀

وہ ایک نقش جو رنگوں کے اختیار میں تھا
کئی صدی سے وہی میرے انتظار میں تھا
یہ حادثہ تو پسِ پردۂ بہار میں تھا
دھواں دھواں تھا مکاں آگ کے حصار میں تھا
شکست و ریخت سے صورت بدل گئی اس کی
وہ ایک سنگ جو خوابدہ کوہسار میں تھا
ترے بدن کو پڑھا ہے کتاب کی صورت
بہت دنوں سے مرا ذہن انتشار میں تھا
جلا دیا اسے مصروفیت کے شعلوں نے
جو رات بھر تری زلفوں کے آبشار میں تھا
وہ شہر غیر میں زنبیل احتیاط لیے
بڑے خلوص سے تحصیل اعتبار میں تھا
چمن میں آتے ہی پیلا ہوا خزاں کا بدن
نہ جانے کیسا اثر بوسۂ بہار میں تھا
ہوا نہ رمزؔ کبھی اُس پہ موسموں کا اثر
وہ سنگ میل جو لپٹا ہوا غبار میں تھا

❀

رنگوں کا امتیاز، غزل کا ہنر نہ دے
میری طرح کسی کو عذابِ نظر نہ دے
ٹوٹے گا سنگِ طنزیہ سے تیرا دل
پتھر کے شہر میں مجھے شیشے کا گھر نہ دے
چاروں طرف زمیں کے دھویں کا غلاف ہے
ایسے میں مرگ ظلمتِ شب کی خبر نہ دے
بستی میں کور چشموں کی سورج کا فائدہ!
بادِ صبا کسی کو نوید سحر نہ دے
تو جانتا ہے راہ میں دشت و سراب میں
ذوقِ سفر نہ ہو جنھیں اذن سر نہ دے
ہر گام پہ جہاں نہ کوئی حادثہ ملے
میرے جنوں کو ایسی کوئی رہ گزر نہ دے
فکرِ معاش ، ذکرِ بتاں ، یاد رفتگاں
قیدی ہوں دائروں کا مجھے بال و پرنہ دے
مانگے نہ رمزؔ یاروں سے دادِ سخن کی بھیک
شاعر بنا کے فطرتِ دریوزہ گرنہ دے

ہر شخص ہے طلسم ہوس میں پھنسا ہوا
یارو ہمارے عہد کے لوگوں کو کیا ہوا
میں کس طرح چھپاؤں گا لوگوں سے دل کا حال
چہرے پہ ہے نوشتۂ قسمت لکھا ہوا
آئینہ ڈھونڈتا ہے شگفتہ مزاج کو
یہ کون ہے کہ جس کا ہے چہرہ بجھا ہوا
خاموش ہوگیا وہ بت سنگ کی طرح
تصویر میں بھی لگتا تھا جو بولتا ہوا
پھر تازہ ہوگیا ہے شکستِ وفا کا زخم
گزرا ہے کوئی آج مجھے دیکھتا ہوا
بھولا ہوا ہوں میں سبب دل گرفتگی
محسوس ہورہا ہے بدن ٹوٹتا ہوا
اب کوئی لغزشوں پہ مجھے ٹوکتا نہیں
وہ مرگیا جو تھا مرے اندر چھپا ہوا
سرگوشیوں کی آگ کی حدت ہے شہر میں
دیکھا تھا اک مکاں کا دریچہ کھلا ہوا
اے رمزؔ لگ رہے ہیں ستارے بجھے بجھے
سورج کے شہر میں بھی کوئی حادثہ نہیں

برسوں میں ترے درکا سوالی رہا تو کیا
کاسہ مری نگاہ کا خالی رہا تو کیا

دنیا اسے حقیر سمجھتی ہے آج بھی
کردار اس کا گرچہ مثالی رہا تو کیا

محرومیوں کی آگ تھی دل میں لگی ہوئی
جلتا ہوا مکان تھا خالی رہا تو کیا

جھوٹی شہادتوں سے پیمبر نہ بن سکا
کچھ دن کسی کا مرتبہ عالی رہا تو کیا

پیتا رہا وہ زہر اندھیروں کا عمر بھر
ابرو کسی حسیں کا ہلالی رہا تو کیا

کیف آفریں تھے خود ہی مضامیں شراب کے
پیالہ مرا شراب سے خالی رہا تو کیا

حسرت ٹپک رہی ہے دریچوں کی آنکھ سے
اُجڑے ہوئے مکان کا والی رہا تو کا

دنیا کو ''مدو جزر'' سے کیا فائدہ ہو
یہ رمزؔ بھی مقلدِ حالیؔ رہا تو کیا

بیچ کے ہم تقدیس غزل کو سوداگر بن جائیں گے
شیشے کا بیوپار کریں گے خود پتھر بن جائیں گے

عقل کے پیرو اہل جنوں کی کج کلہی سے ڈرتے ہیں
آج جو مخلص ہیں کل وہ بھی دشمن سر بن جائیں گے

آنے والی نسلیں ہم کو بھول سکیں نا ممکن ہے
نقش قدم کے مٹتے مٹتے راہ گزر بن جائیں گے

وقت کی گردش پیس بھی دے تو کچھ ہم کو پرواہ نہیں
دوڑیں گے پھولوں کی رگوں میں رنگ سحر بن جائیں گے

لمحوں سے صدیاں بنتی ہیں صدیاں نام تغیر کا
نقش اجنتا جب جاگے گا ہم پتھر بن جائیں گے

دوشِ ہوا پہ رقص کریں گے دامن دامن چمکیں گے
راہ جنوں میں مٹ بھی گئے تو گردسفر بن جائیں گے

جانِ تمنا تم کیا جانو لفظوں میں تاثیر بھی ہے
وقت پڑا تو میرے بھی خنجر بن جائیں گے

رمزؔ شکستہ آئینے کا ہر ٹکڑہ اک چہرہ ہے
شیش محل کو توڑ کے دیکھو سیکڑوں گھر بن جائیں گے

زندگی کیا ہے یہ ایک عمر پہ انداز آیا
داستاں ختم ہوئی نقطۂ آغاز آیا
یہ مرا جرم کہ میں خواب سے چونکا ہی نہیں
وقت ہر دور میں دیتا ہوا آواز آیا
تونے ہر دور میں توہینِ رفاقت کی ہے
''زندگی چھوڑدے پیچھا مرا میں باز آیا''
نشۂ مئے میں جسے پاس روایت بھی رہا
بزم رنداں سے وہی آدمی ممتاز آیا
نہ ملے پھول مگر سنگِ ملامت تو ملا
شکر ہے شہر نگاراں سے سرافراز آیا
کیسا جذبہ ہے یہ کہتے ہیں جسے لوگ وفا
شمع روشن ہوئی اور بزم میں جانباز آیا
آنکھیں دکھلاتے ہیں ''کنجشک فرومایہ'' بھی
ضعف میں کام کہاں پنجۂ شہباز آیا
میں اسے شادؔ کا اعجاز سخن کہتا ہوں
جامِ اردو میں جو لطف مئے شیراز آیا
اپنے احساس کا پیکر یہ تراشے گا ضرور
ہوشیار اہلِ حرم رمزؔ صنم ساز آیا

جو بھی چراغ تھے وہ اندھیروں میں ڈھل گئے
سورج ہتھیلیوں پہ لیے ہم نکل گئے
کیا لوگ تھے جو سنگ کے سانچے میں ڈھل گئے
دستِ ہنر کی آنچ سے پتھر پگھل گئے
ہمت شکن تھا جادۂ ہستی ہر ایک گام
میرا یہ حوصلہ کہ گرے اور سنبھل گئے
اس کی ہتھیلیوں سے شفق پھوٹنے لگی
پلکوں پہ جو چراغ تھے پھولوں پہ جل گئے
میں سربکف ہوں اور کہیں خنجر نہ کوئی سنگ
کیا میرے دوستوں کے ارادے بدل گئے
ہر دور تجرباتِ بشر کا امین ہے
دنیا وہی ہے صرف تقاضے بدل گئے
بازارِ فن میں رمزؔ ہے قحطِ سخن شناس
رد کردۂ عوام جو سکے تھے چل گئے

اس صدی کا جب کبھی ختم سفر دیکھیں گے لوگ
وقت کے چہرے پہ خاک رہ گزر دیکھیں گے لوگ
تخم ریزی کررہا ہوں میں اسی امید پر
پھولتے پھلتے ہوئے کل یہ شجر دیکھیں گے لوگ
عقل انسانی کی جس دن انتہا ہوجائے گی
ختم ہوتے چاند سورج کا سفر دیکھیں گے لوگ

جو بے خودی میں ترا رند بول اٹھتا ہے
وہ بات سارے زمانے کی بات ہے ساقی
بدل ہی دیں گے یہ دستور میکدہ میکش
یہ میرا تجزیۂ نفسیات ہے ساقی
چڑھائے جاتے ہیں سونے کے بت پر کیوں ساغر
یہ میکدہ بھی کوئی ''سومنات'' ہے ساقی
فقیہہ شہر کے حق میں جو زہر قاتل ہے
وہی مرے لیے آب حیات ہے ساقی
میں مضطرب ہوں بہت صبح احمریں کے لیے
پلائے جا ابھی تھوڑی سی رات ہے ساقی
گراں ہے طبعِ تعیش پسند پر اب تک
وہ ایک غم جو غم کائنات ہے ساقی
کلی کو کون تبسم سے روک سکتا ہے
جو مسکرا نہ سکے اور بات ہے ساقی
ہزار رمزؔ کا پردہ پڑا ہوا ہے مگر
جسے زمانہ سمجھ لے وہ بات ہے ساقی

مری زباں کی عبارت ہے گفتگو تیری
مرے فسانے کا عنوان ہے آرزو تیری
عبث کہ مجھ پہ ہے الزام خود فراموشی
حرم سے دیر میں لائی ہے جستجو تیری
فریبِ نکہت گل سے بچا کے دامن دل
زبانِ خار سے سنتا ہوں گفتگو تیری
حجاب میں بھی تجھے بے حجاب دیکھ لیا
ہر ایک پھول میں چہرہ ترا ہے بو تیری
زمانہ طالبِ دیدار ہوتا جلوۂ ناز
بچی ہے طور کے جلنے سے آبرو تیری
رہا نہ پردہ سلامت جمال پردہ نشیں
گلوں نے کھینچ لی تصویر ہو بہو تیری
غرض ہے دیر سے مجھ کو نہ فکر کعبہ سے
میں اپنے آپ میں کرتا ہوں جستجو تیری
جو دیکھا رمزؔ کی آنکھ میں بعد مرنے کے
کھنچی تھی پتلی میں تصویر ہو بہو تیری

عیب جو مجھ میں ہیں میرے ہیں ہنر تیرا ہے
میں مسافر ہوں مگر زادِ سفر تیرا ہے
تیشہ دے دے مرے ہاتھوں میں تو ثابت کردوں
سینۂ سنگ میں خوابیدہ شرر تیرا ہے
تو یہ کہتا ہے سمندر ہے قلمرو میں مری
میں یہ کہتا ہوں کہ موجوں میں اثر تیرا ہے
تونے روشن کئے ہر طاق پہ فرقت کے چراغ
جس میں تنہائیاں رہتی ہیں وہ گھر تیرا ہے
سنگ ریزے تو برستے ہیں مرے آنگن میں
جس کا ہر پھل ہے رسیلا وہ شجر تیرا ہے
میں تو ہوں اتنا بھی تہی دست نہیں
ہاں مگر ضابطۂ راہ گزر تیرا ہے
لاکھ بے مایہ ہوں اتنا بھی تہی دست نہیں
میری آنکھوں کے صدف ہیں یہ گہر تیرا ہے
مجھ کو تنہائی سے رغبت تجھے ہنگاموں سے پیار
ظلمتِ شب مری ہے تو بھنور تیرا ہے
ڈوبتے ہیں سفینے یہ خطا کس کی ہے
تہہ نشیں موج مری ہے تو بھنور تیرا ہے
رمزؔ ہر تہمت ناکردہ سے منسوب سہی
یہ مگر سوچ لے اس میں بھی ضرر تیرا ہے

خدمتِ فن کا یہ جذبہ کبھی کم مت رکھنا
جب تلک ہاتھ میں جنبش ہے قلم مت رکھنا
قصۂ جبر کا ہر رات وظیفہ لازم
طاق نسیاں پہ زمانے کے ستم مت رکھنا
پیش آئے گا سلگتے ہوئے صحرا کا سفر
پاؤں کے نیچے کبھی سبزۂ نم مت رکھنا
میرا دعوا ہے کہ جینے کا مزہ آئے گا
شرط اتنی ہے کہ تخمینۂ غم مت رکھنا
کرنہ پائے گا کبھی اپنی انا کی تسکین
جس کو سب پوج رہے ہیں وہ صنم مت رکھنا
دشمنوں میں ابھی احساس وضع داری ہے
دوستوں سے کبھی امیدِ کرم مت رکھنا
خاک ہوگا تو پتہ بھی نہ چلے گا تجھ کو
اپنے سینے میں کوئی شعلۂ نم مت رکھنا
جانے کس وقت بدل جائے سمندر کا مزاج
اپنی کشتی سے جزیرے پہ قدم مت رکھنا
جھوٹ کو سچ نہ بتانا کبھی تحریروں میں
بے ضمیری جو سکھائے وہ قلم مت رکھنا
شام میخانے کی ہوتی ہے گنہگار بہت
رمزؔ آنکھوں میں وہاں صبحِ حرم مت رکھنا

تیرا کرم جو شریکِ حیات ہے ساقی
نفس نفس نگہہ التفات ہے ساقی
تری نگاہ ہے محدود صرف محفل تک
مری نگاہ میں کل کائنات ہے ساقی
یہ کیا غضب ہے کہ آئین میکدہ کے خلاف
یہاں بھی کشمکشِ ذاتیات ہے ساقی
جو بے خودی میں ترا رند بول اٹھتا ہے
وہ بات سارے زمانے کی بات ہے ساقی
بدل ہی دیں گے یہ دستور میکدہ میکش
یہ میرا تجزیۂ نفسیات ہے ساقی
چڑھائے جاتے ہیں سونے کے بت پر کیوں ساغر
یہ میکدہ بھی کوئی ''سومنات'' ہے ساقی
فقیہہ شہر کے حق میں جو زہر قاتل ہے
وہی مرے لیے آب حیات ہے ساقی
میں مضطرب ہوں بہت صبح احمریں کے لیے
پلائے جا ابھی تھوڑی سی رات ہے ساقی
گراں ہے طبعِ تعیش پسند پر اب تک
وہ ایک غم جو غم کائنات ہے ساقی
کلی کو کون تبسم سے روک سکتا ہے
جو مسکرا نہ سکے اور بات ہے ساقی
ہزار رمز کا پردہ پڑا ہوا ہے مگر
جسے زمانہ سمجھ لے وہ بات ہے ساقی

حریص شب کبھی آسودۂ سحر نہ ہوا
یہ کار و بار ہوس ہے جو مختصر نہ ہوا
کسی سے ہو نہ سکا خود گزیدگی کا علاج
یہ زہر وہ ہے کہ تریاق کا اثر نہ ہوا
سبھوں کو بھول گیا کاروبارِ ہستی میں
میں اپنے آپ سے اک پل بھی بے خبر نہ رہا
جو آج تک مرے لمسِ قلم سے ہے محروم
وہ حرف حرف تو ہے حرفِ معتبر نہ ہوا
عجیب بات ہے پتھر پہ رہ گیا محفوظ
وہ نقش پا جو کبھی نقشِ رہ گزر نہ ہوا
تھکن سے چور تھے رکتے تو پھر قیامت تھی
بھلا ہوا جو کہیں سایۂ شجر نہ ہوا
وہ آدمی جو مقام بشر سمجھ نہ سکا
تمام عمر فرشتہ رہا بشر نہ ہوا
خدا پرستی نہیں ہے تو خود پرستی سہی
مگر جبیں کو مری ذوق سنگ درنہ رہا
اسے خیال تھا تشکیل جادۂ نو کا
کسی کے ساتھ وہ آمادۂ سفر نہ ہوا

❀

غربت میں بے پناہ رہے اپنے گھر کے بعد
ہجرت کا زخم بھر نہ سکا عمر بھر کے بعد

پھیلا رہے ہیں لوگ اندھیروں کی چادریں
سازش یہ کون سی ہے نمودِ سحر کے بعد

دل میں نہ جو درد تو پھر دل کا مول کیا
بے آبرو و صدف ہے وداعِ گہر کے بعد

پہلے ہی دل کو وقت نے ویران کردیا
اجڑے ہزاروں شہر مگر اس نگر کے بعد

پیچھے جو قافلے تھے وہ کوسوں نکل گئے
ہم تھک کے رک گئے جو تکان سفر کے بعد

فرصت کہاں جو بیٹھ کے ہم تبصرہ کریں
”لیں گے سفر کا جائزہ ختم سفر کے بعد“

پتھر سے پہلے طنز کے پتھر برس گئے
ٹوٹا ہے آئینۂ دل آئینہ گر کے بعد

فیضانِ نور رمزؔ ہے اوروں کے واسطے
کالا ہے اپنا ہاتھ دعائے سحر کے بعد

❀

تلامذۂ رمزؔ عظیم آبادی

اس فہرست میں چند ایسے ہیں، جنھوں نے مرحوم رمزؔ عظیم آبادی سے اپنے کلام پر مشورۂ سخن کیا، چند ایسے بھی ہیں جنھوں نے مشورۂ سخن کیا؛ مگر مشتہر ہونے سے احتراز کرتے رہے اور ان میں چند ایسے بھی ہیں، جنھوں نے مرحوم کی زندگی تک ان کی سخنوری سے فیض حاصل کیا۔

جناب مختار باغی کلکتہ	جناب افروز حیات	جناب فراہیم احمد شارب
باری کلکتوی	شاداب رضی	نوین رستوگی
احسن راشد	عبدالجبار عزم	ابوالبرکات حرماں
اثر فریدی	معین کوثر	کیف عظیم آبادی
نجمی عظیم آبادی	احمد شاذ قادری	باقی عظیم آبادی
زمزم مظفر پوری	ضیاء الرحمٰن ضیا	انور پانی پتی
مجیب الرحمٰن بزمی	سہیل اختر	اختر عظیم آبادی
یعقوب تابش	کاظم رضا	رشید عارف
اعجاز بن ضیا اوگانوی	افتخار عاکف	صبا نعیمی
جنوں اشرفی	شمیم احمد شمیم	آلِ حسن احمر
احسن حمد	پریم کرن	صدر الزماں عزم
خادم بلخی	لکشمن بہاری ماتھر	بدیع الزماں سحر
قسیم اختر	وغیرھم	--